BAIS103CCT

عقیدہ، قرآن اور حدیث

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

برائے

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے)

(تیسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد - ۳۲، تلنگانہ - بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course-Bachelor of Arts

Edition: **2021**

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	۲۰۲۱
تعداد	:	**1000**
ترتیب وتزئین	:	محمد حاذق۔ صالح امین، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
سرورق	:	ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

عقیدہ، قرآن اور حدیث

Faith, Quran and Hadith

For B.A. 3rd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

اکائی 1 : ایمانیات: توحید،رسالت،آخرت

اکائی کے اجزاء

1.1 مقصد

1.2 تمہید

1.3 توحید

1.3.1 زندگی پر توحید کے اثرات

1.3.2 توحید کی عقلی دلیل

1.4 رسالت محمدی

1.4.1 رسالت محمدی کی عقلی دلیل

1.4.2 رسالت محمدی کے امتیازی پہلو

1.5 آخرت

1.6 خلاصہ

1.7 نمونۂ سوالات

1.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ اسلام کا بنیادی عقیدہ کیا ہے؟ کن باتوں کو ماننا ایمانیات کہلاتا ہے؟ اور ایمانیات میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدوں کا کیا مطلب ہے؟ نیز وہ یہ بھی جان لیں گے کہ توحید میں کیا باتیں آتی ہیں اور زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ رسالت محمدی کی خصوصیات اور امتیازات کیا ہیں اور آخرت کے عقیدہ کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں؟

1.2 تمہید

ایمانیات دراصل ان باتوں پر ایمان لانے کا نام ہے جو اسلام کا بنیادی عقیدہ کہلاتے ہیں۔اس میں سات باتوں کا عقیدہ رکھنا شامل ہے: اللہ کو ماننا، اس کے تمام رسولوں کو ماننا، اس کی نازل کو ہوئی تمام آسمانی کتابوں کو ماننا، اس کے تمام فرشتوں کو ماننا، قیامت کے دن کو ماننا، اچھی اور بری تقدیر اللہ کی طرف سے ہونے کو ماننا اور اس بات کو ماننا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا جہاں حساب و کتاب ہوگا، جسے آخرت کہتے ہیں۔اسلامی عقیدہ کی ان تمام باتوں کو اجمالی طور پر تین عناوین میں سمیٹ کر توحید، رسالت اور آخرت کا نام دیا جاتا ہے۔

درج ذیل اکائی میں ایمانیات کے ان ہی تینوں عقائد کا تعارف کرایا جائے گا۔اس میں بتایا جائے گا کہ توحید کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ عقیدہ توحید کی عقلی دلیل کیا ہے اور انسانی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس کے بعد حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا تعارف کرایا جائیگا جس میں بتایا جائے گا کہ عقیدۂ رسالت محمدی میں کیا باتیں شامل ہیں، اس کی خصوصیات اور امتیازات کیا ہیں اور اس کو تسلیم کرنے کے عقلی دلائل کیا ہیں؟ پھر آخرت کے عقیدہ پر گفتگو کی جائے گی جس میں آخرت کا مفہوم، قیامت کے دن اور اس کے واقعات نیز حساب و کتاب کے بارے میں بتایا جائے گا۔

1.3 توحید

اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر بتائی گئی ہے، ان میں اول کلمۂ شہادت ہے۔کلمۂ شہادت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ایک ہونے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کے رسول ہونے کی شہادت دی جائے، شہادت کے معنی آنکھوں دیکھی چیزوں کو بیان کرنا ہے، جو چیزیں آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہوں، انسان کو ان کا حد درجہ یقین ہوتا ہے، اسی لئے انتہائی یقین کے ساتھ خبر دینے کو شہادت اور گواہی کہا جاتا ہے، توحید اور رسالت محمدی کی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی انتہائی یقین کے ساتھ توحید اور رسالت کا اقرار کرے---- یہی اسلام کا رکن اول ہے، جو دو جزء پر مشتمل ہے؛ توحید اور رسالت محمدی۔دیگر چار چیزوں کا تذکرہ ارکان اسلام پر گفتگو کے ضمن میں کیا جارہا ہے۔

توحید عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ''ایک ماننے'' کے ہیں، اسلام کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کو ذات اور خصوصی صفات کے اعتبار سے یکتا ماننے کا نام توحید ہے، توحید کے مقابلہ میں ''شرک'' کا لفظ ہے، شرک کے معنی ہیں: اللہ کی ذات، خصوصی صفات اور خصوصی حقوق میں کسی اور کو اللہ کا شریک وسا جھی ٹھہرانا۔

اس طرح گویا توحید کے تین پہلو ہیں: توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی الحقوق۔

''توحید فی الذات'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے تنہا ہے، وہ ایک ہے، نہ کوئی اس کا باپ ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے، نہ بیوی ہے، نہ کوئی اس کا بھائی بہن ہے، نہ کنبہ اور خاندان ہے۔

''توحید فی الصفات'' سے مراد یہ ہے کہ بہت سے تصرفات واختیارات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، کسی اور کا اس میں کوئی حصہ نہیں، رب ہونا، خالق ہونا، رازق ہونا، اولاد دینا، حیات وموت کے فیصلے کرنا، بارش دینا اور اس سے محروم رکھنا، یہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہی ثواب وعذاب دیتا ہے اور مغفرت کے فیصلے کرتا ہے، اللہ کی صفات میں کوئی مخلوق شریک وسہیم نہیں، خواہ وہ کتنے ہی اونچے درجہ کی

حامل ہو۔

بعض اُمور وہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں، جیسے عبادت صرف اللہ ہی کے لیے کی جائے گی، اس لئے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اللہ ہی کے لئے نذر مانی جائے گی، اللہ ہی کی قسم کھائی جائے گی، اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے جانور ذبح کیا جائے گا، دُعاء اللہ سے مانگی جائے گی، سجدہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے جائز نہیں ہوگا، ان حقوق میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا شرک میں داخل ہے، اس کو ''توحید فی الحقوق'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں عقیدۂ توحید کی بڑی اہمیت ہے اور یہ قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا نچوڑ ہے، قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء نے اپنے اپنے عہد میں اس کی دعوت دی اور لوگوں کو شرک سے بچانے کی کوشش فرمائی، شرک اللہ سے بغاوت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو اپنے فضل وکرم سے معاف فرماسکتے ہیں، لیکن شرک ناقابل عفو جرم ہے۔

1.3.1 زندگی پر توحید کے اثرات

توحید صرف ایک عقیدہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی عملی زندگی سے بھی اس کا گہرا ربط ہے، اس سلسلہ میں چند بنیادی باتیں لکھی جاتی ہیں:

(الف) وحدت الٰہ کے تصور سے وحدت انسانیت کا تصور اُبھرتا ہے، جن قوموں میں ذات، پات، اور طبقاتی اونچ نیچ کا تصور رہا ہے، ان کے یہاں خدا اور بندوں کے درمیان انسانوں کے ایک خاص گروہ کو واسطہ بنالیا گیا تھا، کہیں ایک خاص نسل کے لوگوں کو، کہیں ایک خاص رنگ کے لوگوں کو، کہیں شاہی خاندان کو۔ عقیدۂ توحید میں یہ بات شامل ہے کہ کسی انسانی گروہ میں خدائی طاقت یا خدائی صفات کارفرما نہیں ہیں، اس سے تمام انسانوں کے درمیان وحدت اور یکسانیت کا تصور طاقت پاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطبہ میں وحدت الٰہ اور وحدت انسانیت کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے: **إن الٰهكم واحد و إن أباكم واحد** ، یعنی تم سب ایک خدا کے بندے ہو اور ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے اُمت مسلمہ میں ذات پات، علاقہ ووطن، رنگ ونسل اور لسانی بنیادوں پر تعظیم وتحقیر کا تصور پیدا نہیں ہونے دیا، حالاں کہ مغربی قومیت کے تصور نے ان کی صفوں میں بکھراؤ ضرور پیدا کیا، لیکن کبھی ان تعصّبات نے عقیدہ کی صورت اختیار نہیں کی اور نہ اُمت کے سواد اعظم نے ان باتوں کو قبول کیا۔

(ب) عقیدۂ توحید علمی وفنی تحقیق کے جذبہ کو پروان چڑھاتا ہے، انسانی فطرت یہ ہے کہ جس چیز سے اس کا تعلق عقیدت واحترام کا ہوتا ہے، اس کو وہ تحقیق وتنقید سے بالاتر رکھنا چاہتا ہے، اب جو لوگ لوہے، پتھر، درخت، دریا وسمندر اور سیارات و حیوانات وغیرہ کو خدا کا درجہ دیتے ہیں وہ کیسے ان چیزوں کو اپنی تحقیق وجستجو کا ہدف بناسکتے ہیں اور جب انسان کا عقیدہ یوں ہو کہ خدا کے سوا ساری چیزیں اسی کی طرح مخلوق ہیں، بلکہ وہ انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں تو اس کی تحقیق وجستجو میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی، اسی لئے قرآن مجید میں بار بار کائنات میں تدبر کی دعوت دی گئی ہے اور کہیں بھی علم وتحقیق کی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی ہے۔

(ج) توحید کا عقیدہ انسان کے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے، کہ مخلوقات میں بجائے خود نافع اور مضر ہونے کی صلاحیت نہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی سے چیزیں نافع یا نقصان دہ ہوتی ہیں، یہ عقیدہ انسان کے دل سے مخلوق کے خوف کو دور کرتا ہے اور انھیں توہم پرستی سے بچاتا ہے، جو قومیں شرک میں مبتلا ہوتی ہیں، ان میں توہم پرستی پیدا ہو جاتی ہے، وہ بعض جانوروں کو برکت کا اور بعض کو نحس کا سبب سمجھتی ہیں، بعض اوقات کو مبارک اور بعض کو منحوس باور کرتی ہیں، دھوکہ باز انسانوں سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرتی ہیں، اس لئے عقیدۂ توحید کا ایک نمایاں اثر یہ ہے کہ یہ انسان کو توہم پرستی سے بچاتا ہے۔

1.3.2 توحید کی عقلی دلیل

اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے، وہ نہایت سادہ، پیچیدہ اور منطقی بحثوں سے دور، عام فہم اور پوری طرح عقل وفطرت سے ہم آہنگ ہے۔ توحید کا تصور دو باتوں کو شامل ہے، ایک یہ کہ خدا کا وجود ہے اور دوسرے یہ کہ خدا ایک ہی ہے، یہ دونوں باتیں پوری طرح عقل کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں، دنیا میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی موجود نہیں، جو کسی بنانے والے کے بغیر از خود وجود میں آ گئی ہو، تو اتنی بڑی وسیع وعریض اور بے حد متنوع کائنات کسی خالق کے بغیر کیسے وجود میں آسکتی ہے اور کسی مدبر ومنتظم کے بغیر کیوں کر باقی رہ سکتی ہے؟ اس لئے خدا کا وجود پوری طرح عقل کا تقاضہ ہے اور اسی لئے تاریخ کے ہر دور میں تھوڑے سے منحرف لوگوں کو چھوڑ کر سب لوگوں نے اپنے خالق ومالک کے وجود کا اقرار کیا ہے۔

جہاں تک خدا کے ایک ہونے کی بات ہے، تو یہ بھی انتہائی درجہ عقل وفطرت کے مطابق ہے، اس کائنات میں زمین کی طرح نہ جانے کتنے جہان پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب کے سب مسلسل گردش کی حالت میں ہیں اور اس گردش کی رفتار بھی یہ ہے کہ وہ کئی میل فی سکنڈ کا فاصلہ طئے کرتے ہیں، ان بے شمار سیاروں کو قوت کشش نے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح تھام رکھا ہے کہ بغیر کسی ستون کے یہ صحیح وسالم صورت میں موجود ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پوری کائنات ایک دوسرے سے مربوط ہے، یہ الگ الگ مملکتیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی مملکت کے حصے ہیں، اگر ان پر الگ الگ فرماں رواؤں کی حکمرانی ہوتی تو یہ ہرگز اس انضباط، تعاون اور وحدت عمل کے ساتھ اپنا کام جاری نہیں رکھتے، انسان خدا کی سب سے زیادہ باشعور مخلوق ہے، پھر بھی وہ ہر لمحہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہے، تو بصارت وسماعت اور عقل وشعور سے محروم اتنی بڑی کائنات کیوں کر تصادم سے بچ سکتی تھی؟ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ایک ہی خدا ہے، جس کی شان ربوبیت اس پورے نظام کائنات کو چلا رہی ہے، قرآن مجید نے اسی حقیقت کو یوں کہا ہے :

لو كان فيهما آلهة إلا الله لفسدتا ۔(الأنبياء:۲۲)

(اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو زمین وآسمان میں فساد پیدا ہو جاتا)۔

1.4 رسالت محمدی

کلمۂ شہادت کا دوسرا جزء یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، یہ عقیدہ درج ذیل باتوں کو شامل ہے:

(الف) حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔

(ب) آپ ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔

(ج) آپ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، ان پر عمل کرنا اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے، ان سے بچنا واجب ہے اور اگر ان کا ثبوت یقینی دلیلوں سے ہو تو ان کا انکار کرنا کفر ہے۔

(د) آپ نے جو افعال کئے ہوں، ان کی اتباع کرنی چاہئے، بعض افعال کی اتباع واجب اور بعض کی مندوب ہے۔

(ہ) آپ سے محبت رکھنا اور آپ کی تعظیم و توقیر کرنا بھی واجب ہے، نیز آپ کی اہانت باعث کفر ہے۔

(و) نبوت محمدی پر ایمان ان تمام انبیاء پر ایمان لانے کو شامل ہے، جن کا نبی ہونا آپ نے بیان فرمایا ہے، ان کا انکار یا ان کی بے احترامی بھی ایمان سے محرومی کا باعث ہے۔

(ز) آپ کی تشریف آوری کے بعد شریعت محمدی ہی سے نجاتِ اخروی متعلق ہے، اس کے بغیر نجات حاصل نہیں ہوسکتی، کیوں کہ یہ خدا اور اس کے رسول سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔

1.4.1 رسالت محمدی کی عقلی دلیل

(الف) نبی کے نبی ہونے کی دلیل دراصل خود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے، وہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے اتنے بلند درجہ پر فائز ہوتے ہیں کہ اس کے بارے میں جھوٹ اور دھوکہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی زندگی مکہ مکرمہ میں گذاری اس درمیان بہت ہی مختصر مدت کے لئے صرف دو بار آپ کا سفر ہوا، مکہ مکرمہ کی آبادی کا دائرہ اتنا سمٹا ہوا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوری طرح باخبر رہتے تھے، اسی ماحول میں آپ کا بچپن گذرا، آپ کی جوانی گذری، یہاں تک کہ عمر مبارک چالیس سال ہوئی، آپ کی دیانت و امانت اور راست گوئی کی وجہ سے لوگ آپ کو ''صادق اور امین'' کے لقب سے یاد کرتے تھے، جب آپ نے پہلی دفعہ اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو اس وقت آپ نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر تمام اہل مکہ کو جمع فرمایا اور یہی دریافت فرمایا کہ تم نے کبھی مجھے جھوٹ بولتے یا دھوکہ دیتے ہوئے دیکھا ہے، تم نے مجھے سچا پایا ہے یا جھوٹا؟ اور امانت دار پایا ہے یا خائن؟ اس وقت تمام حاضرین کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم سب نے آپ کو صادق و امین پایا ہے۔

ایک ایسا شخص جس پر چالیس سال اس کی صداقت و امانت کا تجربہ کیا گیا اور اس میں اسے کھرا پایا، پھر اس شخص کو دعویٰ نبوت سے دستبردار ہونے کے لئے ان تمام چیزوں کی پیشکش کی گئی، جس کے لئے انسان جھوٹ بول سکتا ہے، یعنی حکومت، مال و دولت اور حسین عورت، مگر اس نے بلا تأمل اسے رد کردیا، نیز اس نے چالیس سال پورا ہونے سے پہلے کبھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا، نہ اس کے آباء و اجداد نے ایسا دعویٰ کیا تھا، تو یقیناً وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس کی زندگی اور اس کا کردار اس کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

(ب) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول میں پیدا ہوئے وہاں تعلیم کا باضابطہ کوئی انتظام نہیں تھا، نہ درس گاہ تھی، نہ لکھنے پڑھنے کا رواج تھا، پورے مکہ میں کل تیرہ آدمیوں کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کوئی تعلیم حاصل کی نہ اہل کتاب

علماء کی صحبت میں کوئی وقت گذارا، نہ کبھی اشعار کہے، نہ خطابت و بیان میں آپ کی شہرت ہوئی، نہ گذری ہوئی اقوام کے حالات سے آپ باخبر تھے، 40 سال کی عمر ہونے تک آپ کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی۔

پھر 40 سال پورے ہونے کے بعد اچانک آپ کی زبان پر ایسا کلام جاری ہوا، جو نہ صرف اپنے مضامین و معانی کے اعتبار سے منفرد رنگ رکھتا تھا، بلکہ اپنی تاثیر اور زبان و بیان کی جاذبیت اور کشش کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ تھا، اس میں انبیاء اور گذشتہ اقوام کے واقعات ہیں، اس میں انسان کی عملی زندگی کے لئے نہایت ہی متوازن اور عادلانہ قوانین ہیں، اس میں عرب کے اس وقت کے معاشرہ کے برخلاف اعلیٰ اخلاقی تعلیمات ہیں، اگر اتنے بلند پایہ کلام کو وہ اپنے آپ کی طرف منسوب کرتا تو پورا خطۂ عرب اس کو خراج تحسین پیش کرتا اور مخالفت وعناد کے کانٹے بچھائے جانے کے بجائے اس پر ستائش کے پھول برسائے جاتے، لیکن اس نے اس کے بجائے صاف اعلان کیا کہ یہ خدا کا کلام ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس کے ناقل ہیں اور پھر فصحاء عرب کو دعوت دی کہ اگر وہ اسے خدا کا کلام نہیں سمجھتے تو اس جیسی ایک سورہ یا دس آیت یا کم سے کم ایک ہی آیت لاکر دکھادیں، یہ چیلنج آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا، لیکن تاریخ میں کبھی بھی اس چیلنج کا جواب نہیں دیا جاسکا۔

(ج) قرآن مجید میں ایسے قصے اور واقعات ذکر کئے گئے ہیں، جن کا عربوں میں کوئی چرچا تک نہیں تھا، بعض واقعات پچھلی آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن قرآن نے ان کو بعینہٖ اسی طرح نقل نہیں کیا ہے، بلکہ ان کتابوں میں جو آمیزشیں کردی گئی تھی، اسے بھی واضح کیا گیا ہے اور گذشتہ کتابوں کے بیانات سے انبیاء کے دامن عمل پر جو داغ پڑتا تھا، قرآن نے اسے دھویا ہے، حالاں کہ آپ نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، نہ آپ نے کبھی تورات وانجیل کو دیکھا تھا، نہ علماءِ اہل کتاب سے استفادہ کیا تھا، یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ایک ہی سرچشمۂ علم سے گذشتہ پیغمبروں کو بھی علم حاصل ہوا تھا، جس میں ان کے متبعین نے ملاوٹیں پیدا کردی تھیں اور اسی سرچشمہ سے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بھی علم عطا فرمایا گیا تھا۔

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں، بعض پیشین گوئیوں کا ذکر قرآن میں ہے اور بعض کا احادیث میں، یہ پیشین گوئیاں حیرت انگیز طور پر پوری ہوئیں، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں روم وایران کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی، اس زمانہ میں یہ دونوں مملکتیں سوپر طاقتوں کی حیثیت رکھتی تھیں، یوں تو ہمیشہ ہی ان کے درمیان آویزشیں رہتی تھیں، لیکن نبوت کے پانچویں سال ۶۱۱ء میں ان دونوں ملکوں کے درمیان ایک بڑی جنگ کا آغاز ہوا جو 616ء میں اس طرح ختم ہوئی کہ خود بیت المقدس پر بھی ایرانیوں کا قبضہ ہوگیا، رومی سلطنت کا بیشتر حصہ ایران کے زیر تسلط آگیا اور گرجے مسمار کرکے ان کی جگہ آتش کدے تیار کئے گئے، اس وقت بظاہر رومیوں کے دوبارہ سر اٹھانے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا، عین اس وقت قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ رومی مغلوب ہوگئے ہیں، لیکن مغلوب ہوجانے کے بعد چند ہی سال میں پھر غالب آجائیں گے، (الروم:۱)---- یہ اعلان اس وقت بالکل قیاس کے خلاف تھا، چنانچہ قریش مکہ اس کا مضحکہ اڑانے لگے، لیکن یہ پیشین گوئی اس شاندار طریقہ پر پوری ہوئی کہ ۶۲۵ء میں دوبارہ رومیوں نے اپنے پورے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لئے، چنانچہ بعض اہل مکہ اس سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگئے۔

یہ تو ایک پیشین گوئی کا ذکر ہے، قرآن وحدیث میں درجنوں ایسی پیشین گوئیاں موجود ہیں، جن کی صداقت بہ چشم سر دیکھی جاسکتی ہے، ایسی درست پیشین گوئی اسی کی طرف سے ہوسکتی ہے، جس کو خدائے علم وخبیر کی طرف سے مستقبل کی خبریں پہنچی ہوں۔

1.4.2 رسالت محمدی کے امتیازی پہلو

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں، اور آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا جو پیغام آیا ہے، وہ قیامت تک باقی رہے گا، اس لئے آپ کی سیرت میں بعض ایسی خصوصیات ملتی ہیں، جو دوسرے انبیاء سے آپ کو ممتاز کرتی ہیں، یہاں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) جامعیت

جامعیت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص کے اندر انسانی زندگی کے مختلف پہلو جمع ہوجائیں اور وہ اس لائق ہو کہ زندگی کے مختلف مسائل میں اس کو نمونہ بنایا جاسکے، چنانچہ سیرت محمدی میں یہ بات پوری طرح پائی جاتی ہے، حاکم ہو یا محکوم، فاتح ہو یا مفتوح، خوشی کا موقع ہو یا غم کا، کامیابی کی گھڑی میں ہوں یا ناکامی کی، منصف کی کرسی پر ہو یا خود مقدمہ کا فریق ہو، رات کی تنہائی میں عبادت وریاضت کا موقع ہو یا جنگ کا کارزار گرم ہو، سفر ہو یا حضر، گھریلو اور نجی زندگی ہو یا سماجی مشغولیات ہوں، تاجر ہو یا گاہک، مالدار ہو یا غریب، دوستوں کے درمیان ہو یا دشمنوں کے بیچ، فقر ومحتاجی سے دوچار ہو اور پیہم فاقہ مستیوں میں مبتلا یا دولت وزر کا انبار لگا ہو، رشتوں کے اعتبار سے بزرگ ہو یا عزیز یا برابر کا، اور سن وسال کے اعتبار سے بچہ ہو یا جوان یا بوڑھا، استاذ ہو یا شاگرد، وطن میں ہو یا بے وطن، غرض کہ جو کچھ بھی ہو اور جس حال میں ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کے لئے نمونہ موجود ہے، مذہبی پیشواؤں میں ایسی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کوئی اور نظر نہیں آتی اور اگر رہی ہو تو تاریخ نے اسے محفوظ نہیں رکھا، اسی جامعیت کی طرف قرآن مجید میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے'' **لقد كان لكم فى رسول الله أسوة حسنة** ''(الأحزاب:۲۱) اس آیت میں اُمت کے ہر طبقہ کو تلقین کی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لئے نمونہ ہے۔

(ب) عالمگیریت

عالمگیریت سے مراد ہے کسی چیز کا گروہی امتیاز سے بالاتر اور عالمی حیثیت کا حامل ہونا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی تعلیمات میں یہ پہلو اتنا نمایاں ہے کہ کہ سیرت محمدی کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا، اسی لئے قرآن مجید نے پوری انسانیت کو آپ کی نبوت کا مخاطب قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'' **وما أرسلنٰك إلا كافة للناس بشيراً و نذيراً** ''(سباء: ۲۸) اسی طرح ایک اور موقعہ پر فرمایا گیا کہ آپ تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں،'' **وما أرسلنٰك إلا رحمة للعالمين** ''۔(الأنبیاء:۱۰۷)

گروہی تنگ نظری کی ایک بنیاد رنگ ونسل ہوتی ہے، کہ ایک رنگ ونسل کے لوگ دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں، آپ نے صاف اعلان فرمایا کہ بزرگی وبرائی رنگ ونسل سے نہیں ہے بلکہ تقویٰ سے ہے،'' **لا فضل للعربى على العجمى ولا للأبيض على الأسود إلا بالتقوىٰ ، إن اكرمكم عند الله أتقاكم** ''، آپ نے خاندانوں کے فرق کے بارے میں واضح فرمادیا کہ اس سے

کوئی بڑائی اور چھوٹائی متعلق نہیں ہے، کیوں کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں''**خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها**''(نساء:۱)اور خاندانوں کا اختلاف تفاخر کے لئے نہیں ہے بلکہ تعارف کے لئے ہے،''**وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا**''۔(حجرات:۱۳)

اسی طرح آپ نے کسی دینی منصب کو کسی مخصوص گروہ کے ساتھ خاص نہیں کیا، کوئی بھی صاحب علم اور صاحب تقویٰ مسلمانوں کا امام ہوسکتا ہے، مذہبی یا غیر مذہبی تعلیم کو کسی ایک طبقہ کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حصول علم ہر مسلمان کا فرض ہے،''**طلب العلم فریضة علی کل مسلم**''۔

دعوتِ اسلام کو کسی ایک قبیلہ، علاقہ یا نسل کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا، آپ ﷺ نے جیسے قریش کو دعوت دی دوسرے قبائل اور دوسری اقوام کو بھی دعوت اسلام پیش فرمائی، پس آپ کا لایا ہوا دین ایک آفاقی دین ہے۔

(ج) تاریخی تحفظ

آپ ﷺ کی سیرت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آپ کے ارشادات، معمولات اور آپ کے حالات و واقعات سند کے ساتھ محفوظ ہیں، آپ ﷺ کی سیرت کا سب سے اہم ماخذ قرآن مجید ہے جس میں کہیں ایک حرف کا فرق نہیں پایا جاتا اور جس کے محفوظ ہونے پر تمام حقیقت پسند متفق ہیں، آپ ﷺ کے حالات کو جاننے کا دوسرا ذریعہ حدیث اور سیرت کی روایات ہیں، جن کی پوری سند کتابوں میں مذکور ہے اور اس سند میں آنے والے راوی کے حالات بھی فن اسماء رجال کے ذریعہ محفوظ کر دیئے گئے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف آپ کی ہدایات محفوظ ہیں؛ بلکہ آپ کی زندگی کے جزوی واقعات یہاں تک کہ نجی زندگی کے حالات بھی روشنی میں ہیں۔

(د) عقل وفطرت سے ہم آہنگی

پیشوایان مذاہب میں آپ ﷺ کی تعلیمات چوں کہ بغیر کسی ملاوٹ کے محفوظ ہیں، اس لئے ان میں عقل وفطرت سے حد درجہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے، آپ نے بہت سے احکام اپنے عہد کے مروجہ قوانین و روایات کے خلاف دیئے اور جوں جوں انسان علم وعقل کا سفر طے کرتا جاتا ہے، وہ ان ہدایات کو اپنے لئے مشعل راہ بنانے پر مجبور ہے، یہاں اس سلسلے کی چند موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں:

- آپ نے مخلوقات کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ یہ مخلوقات انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔
- آپ نے بتایا کہ عورتیں کوئی الگ مخلوق نہیں ہیں؛ بلکہ مرد وعورت ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔
- آپ نے عورتوں کو میراث کا حق دیا۔
- آپ نے نشہ آور چیزوں کو ممنوع قرار دیا۔
- آپ نے بیوگان کے نکاح کی ترغیب دی۔
- اگر زوجین کے درمیان تعلقات خوشگوار نہ رہ سکیں تو طلاق کی گنجائش رکھی۔
- سود کے ذریعہ غریبوں کے استحصال کو منع فرمایا۔

- خاندانی بادشاہت کے بجائے خلافت کا تصور دیا۔
- علم کے حصول پر زور دیا اور اس میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی۔
- کائنات میں فکر و تدبر کی تلقین کی۔

یہ چند نکات سرسری طور پر ذکر کئے گئے ہیں ورنہ اگر غور کیا جائے تو آپ کی ایک ایک تعلیم عقل و فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

(ہ) ختم نبوت

بچہ جب پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے جو لباس سلایا جاتا ہے وہ چند ہی دنوں میں چھوٹا ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ بڑھتے بڑھتے جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس وقت جو لباس اس کے بدن پر فٹ ہوتا ہے وہ آخر وقت تک اس کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے، اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت مبعوث فرمایا جب تمدن اور انسانی شعور شباب کی دہلیز پر تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی شریعت دی گئی کہ اس دنیا کے بوڑھاپے یعنی قیامت تک کے لئے کافی ہو جائے، لہٰذا آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کی شریعت آخری شریعت ہے اور آپ ﷺ کی اُمت آخری اُمت ہے، آپ ﷺ کے بعد کسی طرح کی نبوت کی گنجائش باقی نہیں رہی، اس بات کو قرآن و حدیث میں بہت ہی وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور اس پر اُمت کا اجماع اور اتفاق ہے، اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے: ''**ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین**''، حدیث ہے کہ مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا: ختم بی النبیون، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا، تو حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں صحابہ کا پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے۔

پھر غور کریں تو عقل کا تقاضا بھی یہی ہے؛ کیوں کہ نبی تین کاموں کے لئے آیا کرتے تھے، یا تو اس لئے کہ پہلی شریعت کے احکام منسوخ کئے جاتے اور نئی شریعت نازل کی جاتی، جب کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نئی شریعت نہیں آسکتی، دوسرے نبی اس لئے آتے تھے کہ گذشتہ پیغمبروں کی شریعت میں جو ملاوٹ کی گئی ہے اسے دور کر دیں، لیکن قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، اس لئے آپ ﷺ کی تعلیمات میں کوئی ملاوٹ پیدا نہیں کی جاسکتی، تیسرے ایک نبی کو دوسرے نبی کی مدد کے لئے بھیجا جاتا تھا، جیسے حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ کی مدد کے لئے بھیجا گیا تھا، اگر اس طرح کوئی نبی بھیجا جاتا تو آپ ﷺ کی زندگی ہی میں بھیجا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میرے بعد بھی نبوت کی گنجائش ہوتی تو عمرؓ نبی بنائے جاتے، پس آپ ﷺ کی نبوت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کا لایا ہوا دین قیامت تک کے لئے ہے۔

1.5 آخرت

1.5.1 عقیدۂ آخرت

توحید و رسالت کے بعد اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ 'آخرت' کا ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ انسان مر جانے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ختم ہوجائے، بلکہ ایک وقت آئے گا کہ خدا کے حکم سے یہ کائنات درہم برہم کردی جائے گی، جسے قیامت کہتے ہیں، پھر انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، خدا کی طرف سے انسان کی نیکیوں اور برائیوں کا پورا ریکارڈ محفوظ ہے، یہ ریکارڈ جو پہلے سے خدا کے علم میں ہے، انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اور انسان کی نیکیوں اور برائیوں کے بارے میں حساب وکتاب ہوگا، خدا جن گناہوں کو معاف کرنا چاہے معاف کردے گا ، پھر نیکیوں کا اجر اور برائیوں پر عذاب دیا جائے گا۔

اجر وثواب کی جگہ جنت ہوگی جو انسان کی خواہشات اور تصورات سے بھی زیادہ خوبصورت، راحت بخش اور کشادہ ہوگی اور جو لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، اس کے برخلاف سزا کی جگہ دوزخ ہوگی، یہ اتنی بھیانک اور تکلیف دہ ہے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں اس کا تصور بھی دشوار ہے، کچھ لوگ تو عارضی طور پر دوزخ میں ڈالیں جائیں گے اور کچھ عرصہ کے بعد نکال دیئے جائیں گے، اور ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی، جن کے لئے دوزخ ہمیشہ کا ٹھکانہ ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو ایمان سے محروم تھے۔

1.5.2 انسانی زندگی پر عقیدہ وآخرت کا اثر

عقیدۂ آخرت کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے، یہ عقیدہ انسان کو قانون پر قائم رکھنے اور لاقانونیت سے بچنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جس وقت رات کا اندھیرا ہو، کوئی نگاہ جرم کو دیکھنے والی اور کوئی زبان اس پر ٹوکنے والی نہیں ہو، اس وقت یہی آخرت میں جواب دہی کا احساس ہے جو مجرم کے ہاتھ کو تھام لیتا ہے اور اس کے اندر عمل کی تحریک پیدا کرتا ہے، ایک تو نفع کی اُمید اور اسے حاصل کرنے کا شوق، دوسرے پکڑ کا اندیشہ اور اس سے بچنے کی فکر، اور یہ کیفیت عقیدہ آخرت سے حاصل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو قومیں تصور آخرت سے محروم ہیں وہ علم وسائنس میں کتنی ہی ترقی کر جائیں؛ لیکن شراب، زنا، بداخلاقی، چوری ورہزنی اور دوسرے جرائم میں پیش پیش رہتی ہیں؛ کیوں کہ وہ اجر و ثواب کی طلب اور خدا کے عذاب کے خوف دونوں سے عاری ہیں۔

5.5.3 عقلی نقطۂ نظر

قرآن مجید نے قیامت کے ممکن ہونے پر اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو خدا اپنی مخلوق کو پہلی بار کسی نمونہ کے بغیر عدم سے وجود میں لاسکتا ہے، کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ انسان کو دوبارہ زندہ کرکے اس پر ثواب وعذاب کے احکام جاری کرے؟ قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ دنیا کا تباہ وبرباد ہونا اور مرنے کے بعد دوبارہ انسان کا زندہ کیا جانا دونوں ہی عقلاً ممکن ہے۔

فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے سلسلہ میں پورا پورا انصاف حاصل ہو، یعنی نیکیوں کی پوری جزاء اور گناہوں کی پوری سزا اس کو دی جائے، مگر عملاً دنیا میں ایسا ہوتا نہیں ہے، مثال کے طور پر ایک شخص نے کسی کو تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپئے دیدیئے، اس شخص نے اس رقم سے میڈیکل کی تعلیم مکمل کی اور ڈاکٹر بن گیا، پھر تیس پینتیس سال تک اس فن کو استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے آرام دہ مکان بنایا، اپنے بچوں کو تعلیم دلائی اور خود بھی کشادگی اور گنجائش کی زندگی گذاری اور نہ جانے کتنے لاکھ اس کے ذریعہ کمائے، اب اگر یہ شخص اپنے محسن کو اس احسان کا بدلہ دینا چاہے تو اس کے ایک لاکھ روپئے واپس کردے گا، زیادہ سے زیادہ لاکھ دو لاکھ اپنی طرف سے دے گا، لیکن سوچئے کہ کیا اس کے احسان کا پورا بدلہ ہوا؟

یہی حال برائیوں کا ہے، ایک شخص نے کسی کو قتل کردیا، اس کے بچے جو تعلیم حاصل کررہے تھے، حصول تعلیم سے محروم ہوگئے، اس کی

بیوی کو سالہا سال تنگی وسختی میں زندگی گذارنی پڑی، اس کے بوڑھے والدین نے تکلیفیں اٹھا اٹھا کر اپنی جان دیدی اور مقتول کے پورے خاندان کو سخت صدمہ سے گذرنا پڑا، اب دنیا میں زیادہ سے زیادہ اس ظالم شخص کو سزا کے طور پر قتل کیا جاسکتا ہے، لیکن کیا اس سے تمام تکلیفوں کا مداوا ہوجائے گا؟ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں پورا بدلہ کسی کے لئے ممکن نہیں ہے، چاہے نیکی کا اجر ہو یا برائی کی سزا، دنیا میں ادھوری ہوتی ہے، اس لئے اس کائنات کی فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ ایک اور ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں انسانیت کو پورا پورا انصاف مل سکے اور یہ جگہ آخرت ہے۔

یہ تو پورے پورے جزاء وسزاء کی بات ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے لوگوں کو دنیا میں انصاف نہیں ملتا، وہ اپنی بھلائی پر جزاء سے محروم رہتا ہے، مجرم کو اس کے گناہ اور جرم کی سزا نہیں ملتی، جب کہ جزاء وسزاء کا قانون خدا نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے، پس آخرت ہی ایسی جگہ ہے جہاں لازمی طور پر انسان کو انصاف فراہم ہوگا اور جزاء وسزاء کا قانون مکمل طور پر ظہور میں آئے گا۔

پس موت کے بعد اچھے اور برے اعمال پر جزاء وسزاء کا مرتب ہونا فطرت کی آواز ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ انسانوں کی غالب ترین اکثریت تصور آخرت کی قائل رہی ہے، گو مختلف مذاہب میں اس کی تفصیلات الگ الگ ہیں، مگر اس کے مقابلہ اس کے منکرین کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی ہے۔

1.6 خلاصہ

- اسلام کے پانچ بنیادی ارکان ہیں، جن میں پہلا رکن ''کلمۂ شہادت'' ہے اور کلمۂ شہادت کا پہلا جز توحید ہے۔
- توحید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات وصفات واختیارات اور مخصوص حقوق----عبادت، دُعاء وقربانی، سجدہ وغیرہ----میں یکتا سمجھا جائے۔
- توحید کے تصور سے انسانی وحدت کا تصور اُبھرتا ہے، کائنات میں تحقیق کا جذبہ پروان چڑھتا ہے اور انسان کو توہم پرستی سے نجات ملتی ہے۔
- عقیدۂ توحید عقل وفطرت کے عین مطابق ہے، کیوں کہ کائنات کا اگر ایک سے زیادہ رب ہوتا تو اس کے نظام میں انضباط اور تعاون باقی نہیں رہتا۔
- کلمۂ شہادت کا دوسرا جز یہ ہے، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔
- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جامعیت، عالمگیریت اور عقل وفطرت سے ہم آہنگی ہے، نیز آپ کی سیرت تاریخی طور پر پوری طرح محفوظ ہے۔
- آپ ﷺ کی نبوت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت آپ پر ختم ہو چکا ہے، اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔
- اسلام کا تیسرا عقیدہ ''آخرت'' کا تصور ہے، یعنی قیامت قائم ہوگی، انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اپنے ایمان واعمال کے اعتبار سے جنت ودروزخ میں داخل کیے جائیں گے۔

1.7 نمونۂ سوالات

مختصر جوابی سوالات:

1۔ توحید کا معنی ومفہوم اور اس کی قسموں کی وضاحت کیجئے۔

2۔ انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے کیا اثرات پڑتے ہیں؟

3۔ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں کیا کیا باتیں شامل ہیں؟ اور ختم نبوت کا مطلب ومراد کیا ہے؟ واضح کیجئے۔

طویل جوابی سوالات:

1۔ عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت پر عقلی دلیلیں پیش کیجئے۔

2۔ نبوت محمدی پر آپ کیا عقلی دلیلیں پیش کر سکتے ہیں؟

3۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے چند امتیازی خصائص پر روشنی ڈالئے۔

1.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1۔ حقیقت توحید (اُردو) : مولانا امین احسن اصلاحی

2۔ اسلامی تہذیب کے اُصول ومبادی (اُردو): مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

3۔ مذہب اور جدید چیلنج (اُردو) : مولانا وحید الدین خاں

4۔ خطبات مدراس (اُردو) : علامہ سید سلیمان ندوی

۔:oOo:۔

اکائی 2 : اسلام کے بنیادی ارکان : نماز اور روزہ

اکائی کے اجزاء

2.1 مقصد

2.2 تمہید

2.3 نماز

2.3.1 اہمیت وفضیلت

2.3.2 تربیتی پہلو

2.3.3 احکام ومسائل

2.4 روزہ

2.4.1 تربیتی پہلو

2.4.2 احکام ومسائل

2.5 خلاصہ

2.6 نمونۂ سوالات

2.7 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

2.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اسلام کے بنیادی ارکان کو اچھی طرح جان لیں گے، اور انھیں واقفیت ہو جائیگی کہ نماز کسے کہتے ہیں؟ اس کی کیا اہمیت ہے؟ نماز کے ضروری احکام ومسائل کیا ہیں؟ اور نماز پڑھنے سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ اسی طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ روزہ کے کیا احکام ہیں اور روزہ کس طرح انسان کی تربیت کا کردار ادا کرتا ہے؟

2.2 تمہید

رکن کے عربی زبان میں مختلف معانی آتے ہیں، ان ہی میں ستون اور بنیاد بھی ہے، اسی مناسبت سے کسی چیز سے متعلق اہم ترین

افعال کورکن کہا جاتا ہے، جس کی جمع ارکان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ چیزوں پر اسلام کی بنیاد ہے، کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، گویا اسلام میں ان پانچوں اُمور کی خصوصی اہمیت ہے، اسی لئے ان کو ارکان اسلام کہا جاتا ہے۔ کلمہ شہادت پر گفتگو ایمانیات والی اکائی میں کی گئی ہے، بقیہ چار ارکان کا تعارف ارکان اسلام کے تحت ہے، چنانچہ اس اکائی میں اسلام کے ان ہی بنیادی ارکان کا مختصر تعارف کرایا جائے گا۔ بنیادی ارکان میں سب سے پہلے نماز کی اہمیت وفضیلت بتاتے ہوئے نماز کے اوقات، اس کی شرائط اور ادا کرنے کے طریقے بتائے جائیں گے۔ پھر دوسرے رکن روزہ کا معنی ومفہوم نیز اس کے فوائد پر روشنی ڈالی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ روزہ کے ضروری احکام کیا ہیں؟ روزہ میں کن باتوں کی پابندی ضروری ہے اور کن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

2.3 نماز

نماز کو عربی زبان میں ''صلوٰۃ'' کہتے ہیں، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی میں دُعاء کے ہیں، نماز کی روح دُعاء ہے اور نماز میں پڑھے جانے والے تمام کلمات اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا، تسبیح وپاکی اور دُعاء پر مشتمل ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے اس کو صلوٰۃ کہا گیا، اصطلاح میں صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی نیت سے مخصوص افعال کے انجام دینے کو کہتے ہیں، ان افعال کی تفصیل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ذریعہ بتائی اور اُمت کو تلقین فرمائی، کہ جیسے میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح نماز پڑھو ''صلوا کما رأیتمونی أصلی''۔

2.3.1 اہمیت وفضیلت

کلمۂ شہادت کے بعد یہ اسلام کا سب سے اہم رکن ہے، اسی لئے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر ایمان یا رد کفر کے ساتھ ہی نماز کا ذکر کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دین کا ستون قرار دیا ہے، طائف کا وفد بارگاہ نبوی میں قبول اسلام کے لئے آیا اور اس نے درخواست کی کہ انھیں تین چیزوں سے مستثنیٰ رکھا جائے، نماز، جہاد اور صدقہ، آپ ﷺ نے جہاد اور صدقہ سے تو ان کو مستثنیٰ فرمادیا، لیکن نماز کے بارے میں فرمایا: ''جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہیں ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں'' قرآن مجید میں سو سے زیادہ مواقع پر مختلف پہلوؤں سے نماز کا ذکر آیا ہے، نیز توحید کے بعد جو پہلا حکم آپ ﷺ کو دیا گیا، وہ بھی نماز ہی ہے۔ (مدثر:۳)

2.3.2 تربیتی پہلو

اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ ساتھ انسان کی تربیت بھی ہے، چنانچہ نماز میں بھی انسان کے تزکیہ وتربیت کی مؤثر تدبیریں نظر آتی ہیں، یہاں بعض پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) نماز کا ایک اہم مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کا استحضار ہے، جسے قرآن مجید میں ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، ''**أقم الصلوٰۃ لذکری**'' (طٰہٰ:۱۴)۔ چوں کہ انسان سے یہ بات مطلوب ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر موقعہ پر اللہ کو یاد رکھے، اسی لئے شب وروز میں پانچ بار نمازیں رکھی گئی ہیں، یہ استحضار اس طرح ہوتا ہے کہ نماز ایک ایسا عمل ہے، جس میں جسم، عقل اور قلب (دل) سب شریک ہیں اور اس میں ان تینوں چیزوں کی حکیمانہ نمائندگی موجود ہے، جسم کے حصہ میں قیام اور رکوع وسجود آیا ہے، زبان کے حصہ میں تلاوت وتسبیح آئی ہے، عقل کے حصہ میں تفکر وتدبر آیا ہے، قلب کے حصہ میں خشوع وخضوع،

انابت اور رقت کی کیفیت آئی ہے اور قرآن مجید میں ان تینوں کا ذکر موجود ہے، جسم کے اعمال کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے :

''**وقوموا لله قانتين**''۔(بقرہ:۲۳۸)

اور اللہ کے سامنے عاجزوں کی طرح کھڑے رہا کرو۔

''**يا أيها الذين آمنوا اركعوا واسجدوا واعبدوا ربكم وافعلوا الخير لعلكم تفلحون**''۔ (حج:۷۷)

اے ایمان والو! رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو، اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیکی کرتے رہو تا کہ کچھ فلاح پا جاؤ۔

عقل کے اعمال کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے :

''**يا أيها الذين آمنوا لا تقربوا الصلاة وأنتم سكارىٰ حتى تعلموا ما تقولون**''۔(نساء:۴۳)

اے ایمان والو! نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی مت جاؤ، یہاں تک کہ جو کچھ منھ سے کہہ رہے ہو اسے سمجھنے بھی لگو۔

اور قلب کیا عمال کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے :

''**قد أفلح المؤمنون الذين هم فى صلاتهم خاشعون**''۔(مومنون:۱)

یقیناً وہ مومنین کامیاب ہو گئے جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع برتنے والے ہیں۔

گویا انسان کا پورا وجود اللہ کی طرف متوجہ ہو۔

(2) نماز کا دوسرا تربیتی پہلو وہ ہے، جس کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :

''**ان الصلوٰة تنهى عن الفحشاء والمنكر**''۔(العنکبوت:۴۵)

کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

مُنکَر میں تمام گناہ شامل ہیں، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق الناس سے، اس برائی کا مرکز دل ہو، زبان ہو، آنکھ ہو، ہاتھ پاؤں ہوں یا جسم کا کوئی اور حصہ ہو، اور فحشاء سے وہ خاص برائیاں مراد ہیں جو شرم وحیاء اور مسلّمہ اخلاقی قدروں کے خلاف ہیں، جیسے زنا، بے پردگی وغیرہ، فحشاء کا اثر چوں کہ پورے سماج پر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے اخلاقی بیماری نہایت تیزی سے پھیلتی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔

نماز کے فحشاء اور منکر سے روکنے کی بات اس نکتہ سے مربوط ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا، یعنی نماز سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اس کی ذات وصفات کا استحضار ہوتا ہے، خدا کا استحضار اور اس کی نظر کے سامنے ہونے کا احساس، یہ ایسی چیز ہے جو انسان کو گناہ اور بے حیائی سے روکتی

ہے،اسی لئے عملی طور پر بھی یہ بات دیکھی جاتی ہے، کہ جولوگ نماز کے پابند ہوتے ہیں، وہ بہت سی برائیوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔

2.3.3 احکام ومسائل

احادیث میں نماز کی کیفیت، نماز کی شرائط اوراس کے افعال بہت وضاحت کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں، اسی لئے کتب حدیث اور کتب فقہ میں ایک بڑا حصہ احکام نماز سے متعلق ہے، بعض مسائل چوں کہ قرآن وحدیث میں اجمالی طور پر بیان ہوئے ہیں، یا ایسے الفاظ میں ذکر کئے گئے ہیں، جن میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ہے، اس لئے کچھ مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے بھی پایا جاتا ہے، لیکن زیادہ تر یہ اختلاف زیادہ بہتر اور کم بہتر کا ہے، یہاں ان تفصیلات کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا، اس لئے اس سلسلہ میں کتبِ فقہ سے مراجعت کرنی چاہئے، کچھ ضروری احکام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

(الف) شرائط

کچھ اُمور وہ ہیں، جو نماز کے لئے ضروری ہیں، لیکن نماز کے اندر داخل نہیں ہیں، بلکہ نماز شروع کرنے سے پہلے ہی سے ان کا موجود رہنا ضروری ہے، ایسی باتوں کو شرائط کہتے ہیں، جو ''شرط'' کی جمع ہے، شرائط نماز میں تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں:

(الف) نمازی کے جسم، کپڑے اور نماز پڑھنے کی جگہ کا ظاہری نجاست سے پاک ہونا،---ظاہری نجاست سے مراد وہ نجاست ہے کہ خود عقل اور انسانی فطرت اسے ناپاک قرار دیتی ہے، پیشاب، پاخانہ، خون، اور شراب وغیرہ ایسی ہی نجاستیں ہیں، یہ بات ضروری ہے کہ نماز پڑھتے وقت جسم پر یا پہنے ہوئے کپڑے پر، یا ان جگہوں پر جہاں اعضاء سجدہ مس کرتے ہوں، ایسی نجاست نہیں ہو۔

(ب) حکمی نجاست سے پاکی حاصل کرنا،---نجاست کی بعض صورتیں وہ ہیں، جو ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات ہی سے معلوم ہوئی ہیں، جیسے پیشاب کرنے کی وجہ سے اعضاءِ وضو---ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور سر---کا ایک طرح کی ناپاکی میں آلودہ ہوجانا، ایسی ہی ناپاکی کو ''نجاست حکمی'' یا ''حدث'' کہتے ہیں۔

حدث کی دو قسمیں ہیں :

(1) حدث اکبر۔

(2) حدث اصغر۔

- حدث اکبر: سے مراد وہ صورتیں ہیں، جن میں پورے بدن کا غسل واجب ہوتا ہے، غسل بنیادی طور پر چار اسباب کی وجہ سے واجب ہوتا ہے :

(1) ہم بستری کی ہو۔

(2) مرد یا عورت کو بیداری یا خواب کی حالت میں شہوت کے ساتھ مادۂ منویہ کا انزال ہو۔

(3) عورت حیض (ماہواری) سے پاک ہوئی ہو۔

(4) عورت نفاس یعنی ولادت کے بعد آنے والے خون سے پاک صاف ہوگئی ہو۔

ان چاروں صورتوں میں غسل واجب ہوتا ہے اور جب تک غسل نہ کرلیں، نماز نہیں پڑھ سکتے۔

- حدث اصغر: ان باتوں کو کہتے ہیں، جن سے وضو کرنا واجب ہوتا ہے، بنیادی طور پر وہ تین چیزیں ہیں، جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ان کے پیش آنے کے بعد جب تک وضو نہ کرلیا جائے نماز ادا نہیں کی جاسکتی، وہ تین چیزیں ہیں: پیشاب، پاخانہ اور ہوا کا خارج ہونا---- ان کے علاوہ بعض اور اُمور کو بھی ''حدث اصغر'' شمار کیا گیا ہے، لیکن ان کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

- اگر کوئی شخص بیماری یا پانی فراہم نہ ہونے کی وجہ سے غسل یا وضو نہ کرسکے، تو اس کے لئے تیمّم کرنا ضروری ہے۔

- غسل میں سر سے پاؤں تک پورے جسم پر کم سے کم ایک دفعہ پانی بہانا اور پورے جسم سے اس پانی کا گزرنا ضروری ہے، غسل میں کلی بھی کرلینا چاہئے اور ناک میں پانی بھی ڈالنا چاہئے۔

- وضو کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دونوں ہاتھوں کو تین بار گٹوں تک دھوئے، پھر تین بار کلی کرے، تین بار ناک میں پانی ڈالے، اس کے بعد تین بار چہرہ یعنی پیشانی سے ٹھوڑی اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک کا حصہ دھوئے، پھر تین بار دایاں ہاتھ اور تین بار بایاں ہاتھ کہنی تک (کہنیوں سمیت) دھوئے، اس کے بعد ہاتھ بھگو کر پورے سر کا مسح کرے اور سر کے مسح میں بہتر ہے کہ انگوٹھا اور چھوٹی انگلی کو بچائے اور اس سے کانوں کا مسح کرلے، اس کے بعد تین بار پاؤں دھوئے۔

- تیمّم کا طریقہ یہ ہے کہ پاک مٹی پر دونوں ہاتھ مارے اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ کا مسح کرے، پھر دوبارہ مٹی پر ہاتھ مارے اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کا اور دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کا مکمل مسح کرے، یہ تیمّم غسل کی حاجت کی صورت میں بھی ہے اور وضو کی حاجت کی صورت میں بھی۔

- یہ بات ضروری ہے کہ غسل یا وضو پاک پانی سے اور تیمّم پاک مٹی سے کیا جائے۔

(ب) اوقاتِ نماز

☆ فرض نمازوں کے لئے تیسری اہم شرط ''اوقات'' کی ہے، فجر کا وقت صبح صادق کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک رہتا ہے، ظہر کا وقت سورج ڈھلنے کے بعد شروع ہوتا ہے، ظہر کا وقت ختم ہونے کے بعد عصر کا وقت شروع ہوتا ہے اور سورج ڈوبنے تک رہتا ہے، سورج ڈوبنے کے بعد مغرب کا وقت شروع ہوتا ہے اور شفق ابیض کے ڈوبنے تک باقی رہتا ہے، جونہی شفق ڈوبے اور سیاہی پوری طرح چھا جائے عشاء کا وقت شروع ہوجاتا ہے اور صبح صادق کے طلوع ہونے تک رہتا ہے۔

☆ فرض نمازوں کا مقررہ اوقاتِ میں ہی پڑھنا ضروری ہے، اگر بلا عذر تاخیر کردے، یہاں تک کہ وقت گزر جائے، تو نماز قضاء ہوجائے گی، اس میں اجر کم ہوتا ہے اور گناہ کا بھی اندیشہ ہے۔

☆ تین اوقات میں فرض ونفل ہر طرح کی نماز پڑھنا مکروہ ہے :

(1) سورج کے نکلنے کے وقت، جب تک کہ پوری طرح نکل نہ جائے۔

(2) سورج کے وسط آسمان میں آجانے کے وقت، جب تک کہ ڈھل نہ جائے۔

(3) سورج کے زرد پڑ جانے کے وقت، جب تک کہ سورج ڈوب نہ جائے، ہاں، اگر عصر کی نماز ادا نہیں کی ہے تو سورج کے زرد پڑنے اور ڈوبنے کے درمیان بھی ادا کی جاسکتی ہے۔

☆ دو اوقات میں نفل نمازوں کی ممانعت ہے، نماز فجر کے بعد، جب تک کہ سورج طلوع نہ ہو جائے اور عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد جب تک کہ سورج ڈوب نہ جائے۔

(ج) فرضیت و رکعات

☆ شریعتِ اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ انسان بالکل بندۂ نفس ہی نہ بن جائے، کہ اس پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہ ہو اور ایسے احکام بھی نہ ہوں جو انسان کے لئے ناقابل برداشت مشقت اور بوجھ کا باعث ہوں، چنانچہ عاقل، بالغ مردوں اور عورتوں پر نمازیں فرض کی گئی ہیں، نابالغوں اور بچوں پر نماز فرض نہیں ہے، اسی طرح عورتیں جب حالتِ حیض یا حالتِ نفاس میں ہوں، تو ان پر نماز فرض نہیں ہے، بلکہ ناپاک ہونے کی وجہ سے اس حالت میں نماز پڑھنا بھی جائز نہیں ہے، مسلسل بے ہوشی کی حالت میں مبتلا شخص پر بھی نماز فرض نہیں، بیماروں پر نماز فرض ہے، لیکن نماز کے ادا کرنے کے طریقے میں ان کے ساتھ خصوصی رعایت رکھی گئی ہے، وہ کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں تو بیٹھ کر اور بیٹھنے پر قادر نہ ہوں تو لیٹ کر بھی نماز ادا کر سکتے ہیں، رکوع اور سجدہ نہیں کر سکتے ہوں تو اشارہ کرنا کافی ہے، مسافر پر بھی نماز فرض ہے، لیکن ان کے لئے کچھ خصوصی رعایتیں ہیں، جیسے طویل مسافت کے سفر میں چار رکعت والی نمازیں دو رکعت ادا کی جائیں گی، سواری سے اتر کر نماز پڑھنے میں دقت ہو تو سواری پر بیٹھ کر بھی نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے، اگر کسی وجہ سے قبلہ رُخ ہونے میں دقت ہو، تو جس سمت نماز پڑھنے میں سہولت ہو، اس سمت میں نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

☆ فجر میں دو رکعت فرض اور اس سے پہلے دو رکعت سنت ہے، ظہر میں چار رکعت فرض، اس کے بعد دو رکعت سنت ہے اور فرض سے پہلے بھی اکثر فقہاء کے نزدیک چار رکعت سنت ہے، عصر میں چار رکعت فرض ہے، مغرب میں تین رکعت فرض اور اس کے بعد دو رکعت سنت ہے، عشاء میں چار رکعت فرض اور اس کے بعد دو رکعت سنت ہے، نماز عشاء کے بعد ایک اور اہم نماز ''نمازِ وتر'' ہے جو تین رکعت ادا کرنی چاہئے، اس کی تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے دُعاءِ قنوت بھی پڑھی جاتی ہے۔

(د) نفل اور کچھ مخصوص نمازیں

نفل نمازوں میں کوئی تحدید نہیں، لیکن چند مشہور و ماثور نمازوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

☆ نمازِ اشراق: یہ طلوع آفتاب کے بعد اور آفتاب ڈھلنے کے درمیان جو وقت آتا ہے، اس کے نصف اول میں کسی بھی وقت ادا کی جاسکتی ہے، بہتر ہے کہ کم سے کم چار رکعت ادا کرے۔

☆ نصف آخر میں صلوٰۃ الضحیٰ: (نمازِ چاشت) مسنون ہے، جس کا وقت، وقتِ مکروہ شروع ہونے سے پہلے تک ہے، یہ کم سے کم دو رکعت ادا کی جاسکتی ہے۔

☆ اوابین: نمازِ مغرب کے بعد نمازِ اوابین پڑھی جاسکتی ہے، بہتر ہے کہ چھ رکعتیں پڑھی جائیں۔

☆ نمازِ تہجد: عشاء اور فجر کے درمیان کسی بھی وقت پڑھی جاسکتی ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک آخر شب میں ادا کرنے کا تھا اور زیادہ تر آپ ﷺ آٹھ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

☆ نمازِ تراویح: یہ خاص رمضان المبارک میں پڑھی جانے والی نماز ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک بیس رکعت پڑھی جائے گی اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرا جائے گا۔

☆ نمازِ استسقاء: اگر قحط سالی ہو اور بارش نہ ہوتی ہو، تو یہ دو رکعت جماعت کے ساتھ ادا کی جائے گی۔

☆ نمازِ کسوف: سورج گہن کے موقع پر دو رکعت نماز طویل قراءت کے ساتھ جماعت سے ادا کی جائے گی۔

☆ نمازِ حاجت: انسان کو کوئی بھی ضرورت درپیش ہو، اس کے لئے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے حاجت براری کی دُعاء کرنی چاہئے، حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے---اسی لئے زلزلہ، طوفان، غیر معمولی حالات اور استخارہ وغیرہ کے لئے بھی دو رکعت نماز پڑھنا یا کسی خوشی کے موقع پر بطور شکرانہ کے دوگانہ ادا کرنا مستحب ہے۔

☆ مخصوص نمازوں میں عیدین کی نماز بھی ہے، جو پہلی شوال اور دس ذوالحجہ کو مخصوص طریقہ پر ادا کی جاتی ہے اور اس کا ادا کرنا واجب ہے۔

☆ نمازِ جمعہ: جمعہ کے دن مقیم شخص کے لئے ظہر کے بجائے نمازِ جمعہ ادا کرنا ضروری ہے، جس سے پہلے خطبہ دینا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا شرط ہے، جمعہ سے پہلے اور اس کے بعد بھی سنتیں ہیں۔

نماز دراصل خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست ربط و تعلق کا نہایت ہی اثر انگیز اور افضل طریقہ ہے، اس لئے جتنی نفل نمازیں پڑھی جائیں کم ہیں اور ہر اہم موقع کے لئے شریعت میں نماز رکھی گئی ہے۔

(ہ) نماز ادا کرنے کا طریقہ

☆ قبلہ رُخ کھڑا ہو، نماز کی نیت کرے، دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور ''اللّٰہ اکبر'' کہتے ہوئے ہاتھ باندھ لے۔

☆ پھر پہلے ثنا، اس کے بعد تعوذ، پھر ''بسم اللّٰہ'' پڑھے۔

☆ اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے اور سورہ فاتحہ کے ختم پر آمین کہے، نیز پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورہ یا قرآن کی کچھ آیات (کم سے کم تین چھوٹی آیتیں ہوں یا ان کے برابر ایک بڑی آیت) کی تلاوت کرے۔

☆ پھر ''اللّٰہ اکبر'' کہتے ہوئے رکوع میں جائے، رکوع میں کم سے کم تین بار ''سبحان ربی العظیم'' پڑھے، رکوع

سے اٹھتے ہوئے امام ہوتو ''سمع اللّٰہ لمن حمدہ '' کہے، مقتدی ہوتو ''ربنا لك الحمد '' کہے اور تنہا نماز پڑھ رہا ہوتو پہلے ''سمع اللّٰہ لمن حمدہ '' پھر ''ربنا لك الحمد '' کہے۔

☆ اس کے بعد سجدہ میں چلا جائے، سجدہ کی حالت میں ضروری ہے کہ دونوں پاؤں، دونوں گھٹنے، دونوں ہتھیلیاں، پیشانی اور ناک زمین پر ہو، سجدے کی حالت میں کم سے کم تین بار ''سبحان ربی الأعلی '' پڑھنا چاہئے، ایک رکعت میں دو سجدے ہیں، پہلے سجدہ سے ''اللّٰہ اکبر '' کہتے ہوئے بیٹھے، پھر دوبارہ ''اللّٰہ اکبر '' کہتے ہوئے سجدہ میں جائے اور دوسرے سجدہ سے ''اللّٰہ اکبر '' کہتے ہوئے دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو۔

☆ نماز کی دوسری اور چوتھی رکعت میں قعدہ کیا جاتا ہے، اگر چار رکعت والی نماز ہو تو دوسری رکعت والا قعدہ '' قعدۂ اولیٰ'' ہوگا، قعدہ کی حالت میں دوزانو بیٹھنا، اور تشہد پڑھنا ہے اور قعدۂ اخیرہ میں تشہد کے بعد درود اور مخصوص دُعاء بھی پڑھنی ہے، اگر دو ہی رکعت والی نماز ہے، تو دوسری رکعت والا قعدہ ہی قعدۂ اخیرہ سمجھا جائے گا اور اس میں تشہد، درود اور دُعاء پڑھیں گے۔

☆ نماز کے تمام افعال سے فارغ ہونے کے بعد دائیں اور بائیں گردن پھیرتے ہوئے ''السلام علیکم و رحمة اللّٰہ '' کہا جائے گا،---- اس طرح ''اللّٰہ اکبر '' سے نماز کی ابتداء ہوئی تھی اور سلام پر اس کی تکمیل ہوگئی۔

نماز چوں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی ہے، اس لئے نماز کی حالت میں گفتگو کرنے، چلنے اور غیر متعلق کام کرنے، قبلہ سے رُخ پھیرنے وغیرہ کی ممانعت ہے، ایسے افعال سے بعض صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے اور بعض صورتوں میں مکروہ، کتبِ فقہ میں ان کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔

(و) نماز : ایک اثر انگیز عبادت

نماز کی حرکات وسکنات اور اس کے اوراد و وظائف پر غور کیا جائے، تو یہ خدا کی بندگی اور خدا کے سامنے انسان کے عجز و فروتنی کا اعلیٰ ترین مظہر ہے، جس میں انسان خدا کے سوا ہر چیز بشمول اس کی ذات، اس کی وجاہت اس کی دولت و ثروت سب کی بڑائی کی نفی کرتا ہے، پھر پوری نماز میں بار بار اپنے مالک کی حمد و ستائش کے گُن گاتا ہے، تمام کوتاہیوں اور خامیوں سے اس کے پاک اور بالاتر ہونے کا بار بار اعتراف کرتا ہے، خدا کے حضور عرض کرتا ہے کہ اس کی تمام جانی و مالی عبادتیں اسی کے لئے ہیں، اس کے محبوب بندوں پر صلوٰۃ و سلام پیش کرتا ہے، ایک غلامِ بے نوا کی طرح کبھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے، کبھی کمر تک جھکا ہوا ہے اور کبھی اپنی پیشانی اور ناک تک زمین پر بچھائے ہوا ہے، پھر نماز ختم کرتے ہوئے اپنی کوتاہی و تقصیر کا برملا اعتراف کرتا ہے کہ :

الٰہی! میں نے تو اپنی ذات پر بڑی زیادتی کی ہے، آپ کے سوا کوئی نہیں جو میرے گناہوں کو معاف کرے، پس آپ مجھے اچھی طرح اپنی طرف سے معاف کر دیجئے اور مجھ پر رحم فرمائیے، بے شک آپ ہی کوتاہیوں کو معاف کرنے والے اور رحم فرمانے والے ہیں!

اس کے بعد نمازی اپنے دائیں بائیں دوسرے نمازیوں کو سلام کرتا ہے، گویا وہ اب تک اس دنیا میں نہیں تھا، نماز کے ان لمحات میں وہ خدا کی چوکھٹ پر ڈیرہ ڈالے ہوا تھا اور اب وہ پھر خلق اللہ کی طرف واپس آ گیا ہے۔

نماز کی اس پوری کیفیت کو دیکھئے، کہ اس میں کس طرح اپنی ذات کی نفی ہے، خدا کی کبریائی کا اقرار ہے، اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کا اعلان واظہار ہے، اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کا اقرار ہے اور ہر فعل اور ہر قول خدا کے سامنے انسان کی بندگی اور غلامی کا مظہر ہے، واقعہ ہے کہ اس کیفیت کا تربیت نفس اور تزکیہ میں نہایت ہی مؤثر رول ہے اور مذاہب عالم میں ایسی پُر کیف عبادت کی غالباً کوئی مثال نہیں۔

2.4 روزہ

''روزہ'' کو عربی میں ''صوم'' کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی رکے رہنے کے ہیں، روزہ میں چوں کہ انسان بعض باتوں سے دن بھر رکا رہتا ہے؛ اس لئے اس کو ''صوم'' کہا جاتا ہے، اصطلاح میں روزہ عبادت کی نیت سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور جماع سے رکے رہنے کو کہتے ہیں۔

روزہ کی فضیلت اس بات سے ظاہر ہے، کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہ گزشتہ تمام اُمتوں پر بھی فرض رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا ہوں، مختلف گناہوں کے لئے روزہ کو کفارہ بنایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کے اثر کے ختم ہونے کے لئے روزہ نہایت مؤثر عمل ہے، اسی طرح فرض روزوں کے لئے رمضان المبارک کا جو مہینہ منتخب کیا گیا، اس کے بھی بے شمار فضائل حدیثوں میں موجود ہیں اور اسی ماہ کی ایک شب کو شبِ قدر ہونے کا اعزاز حاصل ہے، جو اپنی فضیلت و عظمت اور اس میں ہونے والے اعمال کے اجر وثواب کے اعتبار سے ہزاروں مہینوں سے بڑھ کر ہے۔

2.4.1 تربیتی پہلو

روزہ کا مقصد انسان کے اندر ضبط نفس کی قوت پیدا کرنا ہے، جس کو قرآن مجید کی اصطلاح میں ''تقویٰ'' کہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

''یا أیھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون''۔ (البقرہ:۲۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر فرض کئے گئے تھے، کہ شاید تم تقویٰ اختیار کرو۔

روزہ سے ضبط نفس پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ بنیادی طور پر گناہ کے پیدا ہونے کا تین سبب ہے، زبان، پیٹ، اور نفسانی خواہشات، روزہ کے ذریعہ زبان پر روک لگائی جاتی ہے کہ روزہ دار کوئی خلاف شرع بات نہ کہے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، کسی پر تہمت نہ لگائے وغیرہ، اگر روزہ کی حالت میں کوئی ایسا گناہ کیا جائے جس کا تعلق زبان سے ہے تو گو قانونی اعتبار سے روزہ ٹوٹتا نہیں ہے؛ لیکن روزہ دار اس کے اجر وثواب سے محروم رہتا ہے، حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔

بہت سے گناہ کا سبب انسان کا پیٹ بنتا ہے، سود، جوا، شراب، جھوٹ اور دھوکہ کے ذریعہ پیسہ کا حصول، یہ سب بنیادی طور پر پیٹ ہی کی تسکین کے لئے ہے، روزہ کی حالت میں صبح سے شام تک انسان جائز اور حلال چیز کے کھانے پینے سے بھی گریز کرتا ہے، اس سے پیٹ کی بے جا خواہشات پر کنٹرول کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

مختلف گناہ وہ ہیں جونفسانی خواہشات سے متعلق ہیں، جیسے: زنا، خلافِ فطرت فعل اور بدنگاہی وغیرہ، روزہ کی حالت میں نفسانی خواہشات کی تکمیل کے جائز طریقہ پر بھی کچھ گھنٹوں کے لئے روک لگادی جاتی ہے؛ کہ جوشخص جائز طریقوں میں بھی اپنے نفس پر کنٹرول کررہا ہے، وہ ناجائز اور حرام سے اپنے آپ کو بدرجۂ اولیٰ بچاسکے گا، اس طرح روزہ کے ذریعہ گناہ پر کنٹرول اور ضبطِ نفس کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے سال میں ایک بار مکمل ایک ماہ کا روزہ فرض کیا گیا، کیوں کہ دن دو دن کی فاقہ مستی سے انسان پر زیادہ اثر نہیں ہوسکتا، اور اگر سال بھر روزہ رکھا جاتا تو یہ بھی تربیت کے لئے مفید نہیں تھا، اس لئے کہ انسان جب کسی چیز کا عادی ہوجاتا ہے تو اس سے اس کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اور اس کی اثر انگیزی جاتی رہتی ہے، اسی لئے سال میں صرف ایک ماہ روزہ فرض کیا گیا۔

پھر اس روحانی نفع کے ساتھ ساتھ روزہ میں جسمانی نفع کا بھی پہلو ہے، ایک ماہ کے اس روزہ سے جسمانی فضلہ میں تخفیف ہوتی ہے، اور روزہ دار حضرات عملی طور پر اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ اگر روزہ میں اعتدال کے ساتھ افطار وسحر کیا جائے تو بہت سی بیماریوں میں فائدہ ہوتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ روزہ رکھو اور صحت حاصل کرو" صوموا تصحوا "---- اس کے علاوہ روزہ کی بھوک و پیاس سے انسان کے اندر اپنے ان غریب بھائیوں کی اعانت کا جذبہ اُبھرتا ہے، جن کے لئے مجبوری فاقہ کشی کا سبب بنتی رہتی ہے، اسی لئے رمضان المبارک میں خاص طور پر انفاق کی ترغیب دی گئی ہے اور اس ماہِ مبارک کی تکمیل پر صدقۃ الفطر کا حکم دیا گیا ہے۔

2.4.2 احکام ومسائل

ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں پر روزہ فرض کیا گیا، روزہ کے لئے اس ماہِ مبارک کے انتخاب کی حکمت یہ ہے کہ اسی ماہ میں آپ ﷺ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، اس طرح گویا یہ نزولِ قرآن کا سالانہ جشن ہے، جسے خدا کی بندگی کے ذریعہ اہل ایمان مناتے ہیں۔

روزے بنیادی طور پر تین طرح کے ہیں: فرض، واجب اور نفل۔

☆ ماہِ رمضان المبارک کا روزہ عاقل، بالغ مسلمان مردوں اور عورتوں پر فرض ہے، نابالغوں پر فرض نہیں؛ لیکن جب نابالغ لڑکے اور لڑکیوں میں روزہ رکھنے کی قوت پیدا ہوجائے، تو بہ طور تربیت کے ان سے روزہ رکھوانا چاہئے۔

☆ شرعی مسافت کا سفر کرنے والا مسافر اور ایسا مریض جس کے لئے روزہ رکھنا نقصان دہ ہو، کے لئے گنجائش ہے کہ وہ اس وقت روزہ نہیں رکھے اور بعد میں ان روزوں کی قضا کرلے، اگر کوئی شخص روزہ فرض ہونے اور روزہ رکھنے پر قادر ہونے کے باوجود روزہ نہیں رکھے، تو گنہگار ہوگا اور اس پر ان روزوں کی قضاء واجب ہوگی، اور اگر کوئی رمضان المبارک کا فرض روزہ شروع کرنے کے بعد پھر بلا عذر توڑ دے، تو کفارہ واجب ہوگا، روزہ کا کفارہ ایک روزہ کے بدلے مسلسل ساٹھ روزے رکھنا، یا ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا شکم سیر کرکے کھانا کھلانا ہے، پس جس طرح رمضان کا روزہ فرض ہے، اسی طرح اس روزے کی قضاء یا کفارہ کے طور پر جو روزے رکھے جائیں وہ بھی فرض ہیں، البتہ ان روزوں کے لئے کوئی خاص وقت متعین نہیں۔

☆ جوشخص بہت زیادہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکے، یا ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ بظاہر اس سے شفایاب ہونے کی اُمید نہ ہو اور اس وجہ سے روزہ نہ رکھ پائے، اسے ہر روزہ کے بدلے فدیہ ادا کرنا ہوگا، ایک روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت

اس طرح کھانا کھلانا ہے کہ وہ آسودہ ہو جائے۔

☆ رمضان المبارک کے علاوہ مختلف گناہوں کے کفارہ کے طور پر جو روزے کا حکم دیا گیا ہے، یہ روزے بھی فرض ہیں، اور وہ یہ ہیں :

قسم کا کفارہ : اس میں تین روزے رکھنے ہیں، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کے کپڑے بنوانا۔

ظہار : اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی ماں یا محرم رشتہ دار سے تشبیہ دے، مثلاً یوں کہے ''تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے'' تو اس کا کفارہ مسلسل ساٹھ روزے رکھنا، یا ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہے۔

قتل : اگر کسی مسلمان کو خطاءً قتل کر دے تو اس پر کفارہ ہے۔

☆ واجب روزہ سے مراد نذر کا روزہ ہے، یعنی اگر کسی شخص نے مطلق روزہ رکھنے کی نیت مانی ہو یا کسی خاص شرط کے ساتھ روزے کی منت مانی ہو اور وہ شرط پوری ہو گئی ہو، تو ان دونوں صورتوں میں نذر پوری کرنی واجب ہے۔

☆ نفل روزے دو طرح کے ہیں: ایک تو مقررہ ایام کے، دوسرے بلا تعیین اپنی رغبت کے مطابق،---مخصوص ایام جن میں روزہ رکھنے کی فضیلت منقول ہے، وہ اس طرح ہیں :

یوم عاشوراء: یعنی دس محرم اور اس کے ساتھ ساتھ 9 / یا 11 / تاریخ کا روزہ۔

پندرہ شعبان، یوم عرفہ یعنی 9 / ذی الحجہ، ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات۔

شوال کے مہینہ میں یکم شوال کو چھوڑ کر 6 / دنوں کا روزہ، خواہ مسلسل رکھا جائے یا فصل کے ساتھ۔

ہر مہینہ میں چاند کی 14، 15 ، 16 / تاریخوں کا روزہ۔

☆ پانچ دنوں میں روزہ رکھنا ممنوع ہے: عید الفطر کے دن، یعنی یکم شوال کو، 10 / ذی الحجہ یعنی بقر عید کے دن، 11، 12، 13 / ذی الحجہ یعنی بقیہ ایام تشریق میں۔

☆ حالتِ حیض اور حالتِ نفاس میں روزہ رکھنا جائز نہیں اور اگر رکھ لیں تو روزہ نہیں ہوگا، اس لئے رمضان المبارک میں اگر حیض و نفاس کی نوبت آجائے، تو خواتین اتنے دنوں کے روزے بعد میں رکھیں گی۔

☆ روزہ کی حالت میں کھانے پینے کی کوئی بھی چیز حلق سے نیچے چلی جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اسی طرح اگر بیوی سے صحبت کر لے، تب بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، جو چیزیں روزہ میں ممنوع ہیں، اگر بھول کر کر لی جائیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

☆ روزہ کی حالت میں عام اوقات سے بڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت، ذکر، دُعاء، استغفار، نگاہ اور زبان کی حفاظت مطلوب ہے۔

☆ روزہ کا طریقہ یہ ہے کہ رات کے آخری پہر میں اٹھے اور کچھ مختصر سی چیز کھائے، جس کو سحری کہتے ہیں، سحری کھانا مسنون ہے

، پھر فجر کا وقت شروع ہونے کے ساتھ ہی ان تمام باتوں سے رُک جائے ،جن کی روزہ میں ممانعت ہے، جیسے ہی آفتاب غروب ہواور مغرب کا وقت شروع ہو،فوراً کچھ کھا کر روزہ ختم کرے،اس کو افطار کہتے ہیں،اگر کھجور میسر ہوتو اس سے افطار کرنا بہتر ہے،افطار کے وقت کی جانے والی دُعاء مقبول ہوتی ہے،اس لئے افطار سے پہلے حسب ضرورت دُعاء کرنی چاہئے ، پھر افطار کرتے ہوئے یہ دُعاء پڑھے :

''**اللھم لک صمت وعلیک توکلت و علی رزقک أفطرت**'' ۔

بارِالٰہا! میں نے آپ ہی کے لئے روزہ رکھا ہے،آپ ہی پر میرا بھروسہ ہے اور آپ ہی کے رزق سے افطار کر رہا ہوں۔

پھر افطار سے فارغ ہونے کے بعد اس طرح دُعاء کی جائے :

''**ذھب الظمأ وابتلت العروق وثبت الأجر انشاء اللہ**''۔

پیاس ختم ہوگئی،رگیں تر ہوگئیں اور اجر انشاءاللہ محفوظ ہوگیا۔

☆ تمام ہی عبادتوں میں نیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ روزہ کے درست ہونے کے لئے بھی نیت شرط ہے،قضاء اور کفارات کے روزوں میں ضروری ہے کہ رات ہی میں نیت کر لی جائے ، رمضان المبارک کے روزوں ، نیز نفل روزوں میں بھی افضل طریقہ یہی ہے،لیکن اگر رات میں نیت نہیں کر سکا،تو دن میں بھی آفتاب کے ڈھلنے سے پہلے تک نیت کرنے کی گنجائش ہے،اس کے بعد کی نیت معتبر نہیں۔

2.5 خلاصہ

- نماز دوسرا سب سے اہم رکن ہے،اور اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔
- نماز کا مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد کو تازہ کرنا اور اپنے اندر بے حیائی اور برائی سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔
- نماز کے درست ہونے کے لئے جسم، کپڑا اور نماز کی جگہ کا ظاہری نجاست سے پاک ہونا، نیز باوضو ہونا اور اگر وضو کرنے کی طاقت نہ ہو،

تو تیمّم کرنا ضروری ہے۔

- فرض نمازوں کے مقررہ اوقات ہیں،ان ہی اوقات میں نماز کا ادا کرنا ضروری ہے، نیز کچھ ایسے اوقات بھی ہیں

جن میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

- نماز عاقل، بالغ ،مسلمان مردوں اور عورتوں پر فرض ہوتی ہے، بیماروں اور مسافروں کے لئے کیفیتِ نماز میں

خصوصی رعایتیں ہیں۔

- فرض نمازوں اور بعض نفل نمازوں کی بھی رکعات واوقات متعین ہیں، عام نفلوں کے لئے رکعات واوقات کی تحدید نہیں۔

- نماز کی پوری کیفیت اور تمام افعال واوراد متعین ہیں، جو حدیث سے ثابت ہیں اور فقہاء نے انھیں تفصیل کے ساتھ مرتب کر دیا ہے۔
- روزہ کے معنی صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مرد وعورت کے خصوصی تعلق سے رکے رہنے کے ہیں۔
- روزہ کا بنیادی مقصد نفس کا تزکیہ ہے۔
- رمضان المبارک کے روزے عاقل وبالغ مرد وعورت مسلمانوں پر فرض ہیں، بیمار اور مسافر کے لئے خصوصی رعایتیں ہیں اور حالتِ حیض ونفاس میں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔
- کفارات کے روزے فرض اور نذر کے روزے واجب ہیں، نیز بعض روزے نفل کے درجے میں ہیں۔
- روزہ کے لئے نیت ضروری اور سحر وافطار مسنون ہے۔

2.6 نمونۂ سوالات

مختصر جوابی سوالات:

1۔ صلوٰۃ اور روزہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کیجئے؟
2۔ تکبیر تحریمہ سے سلام تک نمازوں کی کیفیت پر اجمالی روشنی ڈالئے۔
3۔ نفل نماز کی وضاحت کرتے ہوئے بعض مشہور اور ماثور نفل نمازوں کا تعارف کرائیے۔
4۔ روزہ کے تربیتی پہلو کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجئے۔

طویل جوابی سوالات:

1۔ نماز کے درست ہونے کے لئے کیا شرطیں ہیں؟
2۔ نماز کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے تربیتی پہلو کو واضح کیجئے۔
3۔ درج ذیل الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے اوقات مکروہ کی وضاحت کیجئے۔
ظاہری نجاست، حکمی نجاست، حدث اکبر، حدث اصغر، غسل، وضو، تیمّم۔
4۔ روزہ کے اہم احکام ومسائل پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجئے۔

2.7 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1۔ سیرۃ النبی (سوم) (اُردو) : علامہ سید سلیمان ندوی
2۔ ارکان اربعہ (اُردو) : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
3۔ علم الفقہ (اُردو) : مولانا عبدالشکور فاروقی

4۔ اسلامی فقہ (اُردو) : مولانا مجیب اللہ ندوی

5۔ فقہ اسلامی (اُردو) : مولانا منہاج الدین مینائی

6۔ بہار شریعت (اُردو) : مولانا امجد علی

7۔ قاموس الفقہ (اُردو) : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۔:oOo:۔

اکائی 3 : زکوٰۃ

اکائی کے اجزاء

3.1 تمہید

3.2 مقصد

3.3 زکوٰۃ کا مفہوم ومراد

3.4 زکوٰۃ کی اہمیت وفضیلت

3.5 صاحب مال سے متعلق شرطیں

3.6 مال سے متعلق شرطیں

3.7 مصارف زکوٰۃ

3.8 بعض متفرق مسائل

3.9 زکوٰۃ کی حکمت ومصلحت

3.10 اکتسابی نتائج

3.11 نمونۂ امتحانی سوالات

3.11.1 معروضی سوالات

3.11.2 مختصر جوابی سوالات

3.11.3 طویل جوابی سوالات

3.12 تجویز کردہ کتابیں

3.1 تمہید

اس اکائی میں زکوٰۃ سے متعلق مختلف احکام ومسائل پر روشنی ڈالی جائے گی۔ زکوٰۃ کے معنی ومفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اہمیت وفضیلت قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کی جائے گی۔ اس کے بعد کسی بھی شخص پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ضروری شرطوں کی وضاحت کی جائے گی، بعدازاں مال سے متعلق شرطوں اور اس کے نصاب پر گفتگو کی جائے گی۔ مصارف زکوٰۃ پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض اہم مسائل کو بھی زیر بحث لایا جائے گا۔ اور پھر اخیر میں اس کی حکمت ومصلحت کو بیان کیا جائے گا۔

3.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد زکوٰۃ کے اہم احکام ومسائل سے واقف ہونا ہے۔اس ضمن میں زکوٰۃ کے معنی ومراد اور اہمیت وفضیلت سے آگاہی ہوگی۔ساتھ ہی انسان پر زکوٰۃ کے فرض ہونے کی شرطوں اور مال سے متعلق شرطوں سے واقفیت حاصل ہوگی۔ان کے علاوہ زکوٰۃ کے مصارف اور اس کی حکمت ومصلحت کے ساتھ بعض اہم متفرق مسائل سے بھی طلبہ آگاہ ہوسکیں گے۔

3.3 زکوٰۃ کا مفہوم ومراد

رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بنیادی ارکان پانچ بتائے ہیں،ان ارکان میں ایک اہم رکن ''زکوٰۃ'' ہے۔لغت میں زکوٰۃ کے معنی پاکی اور صفائی کے ہیں۔اس معنی میں قرآن کریم میں کئی آیات موجود ہیں،مثلاً سورہ مریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''**وآتیناہ الحکم صبیاً، وحنانا من لدنا وزکاۃ وکان تقیاً**''۔(مریم:13-12)

(اور ہم نے اس کو بچپن میں حکمت ودانائی سے نواز دیا تھا اور اپنی طرف سے رحم دلی اور پاکیزگی عطا کر دی تھی، وہ بڑا ہی پرہیزگار تھا)۔

پاکیزگی کے ہی معنی میں قرآن کریم میں سورہ توبہ کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''**ولکن اللہ یزکی من یشاء**''۔(نور:19)

(لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے پاک وصاف کر دیتا ہے)۔

لغت میں زکوٰۃ کے معنی بڑھوتری اور زیادتی کے بھی ہیں۔امام راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ زکوٰۃ میں بڑھوتری سے مراد دراصل وہ برکت ہے جو زکوٰۃ کی ادائیگی پر بندہ کو اللہ عزوجل کی جانب سے حاصل ہوتی ہے۔(ج1،ص462-461) چنانچہ زکوٰۃ کے اسی مفہوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے:''**العلم یزکو بالانفاق**''یعنی علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔لہٰذا زکوٰۃ کے ان دونوں معانی کے پیش نظر یہ کہنا درست ہوگا کہ زکوٰۃ کو زکوٰۃ کہنے میں دراصل یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کے دل کی صفائی اور پاکیزگی ہوتی ہے کہ مال کی محبت انسان کے دل میں ڈال دی گئی ہے، چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ مال اس کے پاس باقی رہے،لیکن زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ہی وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی عزیز اور محبوب ترین چیز بھی اللہ کی رضا کی خاطر قربان کر دے گا۔پھر زکوٰۃ کے ذریعہ اس مال کی بھی صفائی ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود اسے لوگوں کا میل قرار دیا ہے۔(مسلم:1072) اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اس میں برکت کی بھی امید ہوتی ہے۔

اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے زکوٰۃ سے مراد مال کا وہ مخصوص حصہ ہے جسے شریعت نے معاشرہ کے مالدار افراد پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنا لازم کیا ہے۔یعنی مالدار افراد کے مال میں سے شریعت کی جانب سے مقرر کردہ مخصوص حصہ کو اللہ کے متعین کردہ افراد کو دے دینا اور ان کو اس پر مالک بنا دینا۔اس بابت قرآن کریم میں متعدد آیتیں نازل ہوئی ہیں۔سورہ بقرۃ کی آیت نمبر 43 میں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں:

''**واقیموا الصلاۃ وآتوا الزکوٰۃ**''۔(بقرہ:43)

(نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو)۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ سورہ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''فان تابوا واقاموا الصلاۃ و آتوا الزکاۃ فاخوانکم فی الدین''۔(توبہ:11)

(پھر اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے)۔

سورہ توبہ ہی میں ایک اور جگہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

''والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ، فبشرھم بعذاب الیم، یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم، ھٰذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون''۔(توبہ:35-34)

(اور جو لوگ سونا، چاندی کا خزانہ جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔اس دن دوزخ کی آگ میں اس خزانہ کو گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا،[اور کہا جائے گا] یہی ہے وہ خزانہ جسے تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا؛ لہٰذا اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو)۔

یعنی اگر کوئی زکوۃ ادا کیے بغیر خوب مال و دولت اکٹھا کر کے رکھتا ہے تو اسے اوپر کی آیت میں مذکور سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے گا، لیکن اگر وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کرتا ہے تو وہ ان سزاؤں سے بچ جائے گا۔کیونکہ جس مال کی زکوۃ ادا کردی جائے وہ ذخیرہ اندوزی کرنے میں شامل نہیں ہے۔(مستدرک حاکم:1438)

احادیث نبویہ ﷺ سے بھی زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہے۔ذخیرہ احادیث میں اس سے متعلق متعدد روایات منقول ہیں۔مثلاً اسلام کے ارکان اور بنیادی چیزوں کو شمار کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

''بنی الاسلام علی خمس: شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ، واقام الصلاۃ، وایتاء الزکاۃ، والحج، وصوم رمضان''۔(بخاری:8)

(اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد [ﷺ] اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزہ رکھنا)۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب اہل یمن کا معلم بنا کر بھیجا تو ان کو نصیحت کی کہ پہلے انھیں اللہ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کی دعوت دیں، جب وہ انھیں قبول کرلیں تو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں، پھر جب وہ اس کا بھی اقرار کرلیں تو انھیں تعلیم دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں پر زکوٰۃ واجب کیا ہے، جسے ان کی مالداروں سے لے کر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

''فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم، توخذ من اغنیائھم وترد علی

فقرائھم''۔(بخاری:1395)

3.4 زکوٰۃ کی اہمیت وفضیلت

قرآن کریم اوراحادیث نبویﷺ میں زکوٰۃ کی اہمیت وفضیلت سے متعلق بکثرت آیات اورروایتیں موجود ہیں۔زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے ہونے کی وجہ سے اس کی ادائیگی لازمی ہے۔قرآن کریم میں کم وبیش 20 مقامات پرنماز کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض مقامات پراس کی ادائیگی نہ کرنے پرمختلف سزاؤں سے ڈرایا گیا ہے،جیسا کہ اوپر بیان ہوا،اوربعض جگہوں پراس کی ترغیب دی گئی ہے، مثلاً سورہ مزمل میں اسے اللہ کے حضور میں قرض حسن پیش کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے:

''واقیموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ واقرضوا اللہ قرضا حسنا وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ھو خیراً واعظم اجراً''۔(مزمل:۲۰)

(نمازکی پابندی کرو،زکوٰۃ دیتے رہو،اللہ کواچھی طرح قرض دو،[یعنی اخلاص کے ساتھ نیکی کے راستہ میں خرچ کرو]اورتم اپنے لئے جونیک عمل آگے بھیجو گے،اس کواللہ کے پاس زیادہ بہتراورزیادہ ثواب والا پاؤ گے)۔

سورہ تغابن میں قرض حسن یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تشریح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ خودفرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں دوچندکردیں گے،اورمغفرت کا پروانہ عطافرمائیں گے،آیت ہے:

''ان تقرضوا اللہ قرضاً حسناً یضاعفہ لکم ویغفر لکم، واللہ شکور حلیم''۔ (تغابن:17)

(اگرتم اللہ کوبہترقرض دوگے[یعنی اخلاص کے ساتھ خرچ کروگے]تواللہ تمہارے لئے اس کو بڑھاتے چلے جائیں گےاورتم کومعاف بھی کردیں گےاوراللہ بڑے قدرداں اوربردبار ہیں)۔

سابقہ اقوام کوبھی ان کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی تھی کہ یہی صراط مستقیم اورراست دین ہے۔چنانچہ امت مسلمہ کوان کی ادائیگی کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا گیا:

''وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جائتھم البینۃ، وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلاۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذٰلک دین القیمۃ''۔(بینہ: 5-4)

(اورجواہل کتاب ہیں وہ اس واضح دلیل کے آجانے کے بعدہی اختلاف میں پڑگئے ہیں۔حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کے لئے عبادت کوخالص کرتے ہوئے بالکل یکسوہوکراسی کی عبادت کریں، نمازقائم کریں اورزکوٰۃ دیا کریں اوریہی درست دین ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر اپنے نیک بندوں کی صفات کی نشاندہی فرمائی ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر انھیں اللہ زمین پر اقتدار عطا فرمادیں تو وہ یہاں نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے، اور بالآخر تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (حج: 41) اس قسم کی بکثرت آیتیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ بعض لوگوں کے مطابق قرآن کریم میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے متعلق جو آیتیں وارد ہوئی ہیں ان کی تعداد 82 رتک پہنچتی ہے۔ ذخیرہ احادیث میں بھی اس سلسلہ میں بڑی تعداد میں روایتیں ملتی ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں مذکور ہے حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ ﷺ اسے کوئی ایسا عمل بتادیں جو اسے جنت میں داخل کرادے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم خالص اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، فرض نمازیں پڑھا کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزہ رکھا کرو۔ (حدیث نمبر: 1397) بعض دوسری احادیث میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ جن اہم باتوں پر لوگوں کی بیعت لیا کرتے تھے ان میں ایک زکوٰۃ کی ادائیگی شامل تھی۔ مثلاً بخاری شریف کی ہی ایک حدیث میں حضرت جریر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر بات میں اپنے مسلم بھائی کی خیر خواہی کرنے پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں پر بیعت ہوئے۔ (حدیث نمبر: 1401) ایک اور حدیث میں زکوٰۃ نہ ادا کرنے پر آخرت میں پیش آنے والے عذاب وسزا کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جسے اللہ نے مال سے نوازا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے دن اس کا مال نہایت ہی زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرلے گا، اس کی آنکھوں کے پاس دو سیاہ نقطے ہوں گے جیسے سانپ کے ہوتے ہیں۔ پھر وہ سانپ اسے اس کے دونوں جبڑوں سے پکڑ لے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال اور خزانہ ہوں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی ''**ولا یحسبن الذین یبخلون بما آتاھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم، بل ھو شر لھم، سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ**'' (آل عمران: 180) یعنی جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ یہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے: بلکہ وہ ان کے حق میں نہایت ہی برا ہے جس مال میں انہوں نے بخل سے کام لیا ہے۔ قیامت کے دن ان کو اسی کا طوق پہنایا جائے گا۔ (بخاری: 1403) اسی طرح 'الترغیب والترہیب' کی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نماز تو پڑھتا ہے لیکن وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو وہ مسلمان نہیں اور نہ ہی آخرت میں اس کے نیک اعمال کوئی کام آئیں گے۔ (ج: 2، ص: 108)

ان تمام آیتوں اور حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے بغیر ارکان اسلام مکمل نہیں ہوتے، اسی بنیاد پر مختلف مقامات پر مختلف انداز اور لہجے میں اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں ہدایات وارد ہوئی ہیں کبھی عذاب وعقاب سے ڈرایا گیا ہے اور کبھی دوگنا اجر وثواب کی نوازش سے ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ زکوٰۃ کی اسی اہمیت وفضیلت کے پیش نظر حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہد خلافت میں زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا اور ان کو راہ راست پر لاکر دم لیا تھا۔

3.5 صاحب مال سے متعلق شرطیں

زکوٰۃ کی فرضیت کی شرطوں کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، پہلی قسم کی وہ شرطیں ہیں جو زکوٰۃ ادا کرنے والے شخص سے متعلق ہیں، اور دوسری قسم کی شرطیں وہ ہیں جن کا تعلق مال سے ہے۔ آیئے پہلے صاحب مال یعنی زکوٰۃ ادا کرنے والے شخص سے متعلق شرطیں کو جانتے ہیں:

1- مسلمان ہونا:

کسی شخص پر زکوٰۃ کی فرضیت کے سلسلہ میں پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، کیونکہ ارکان اسلام کی ادائیگی کا وہی مکلّف ہے جس نے کلمہ شہادت کا اقرار کیا ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص بے شمار مال و دولت کا مالک ہو، لیکن وہ کلمہ شہادت کا منکر ہو تو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی۔ پھر یہ کلمہ شہادت کا منکر پیدائشی ہو یا پہلے مسلمان تھا بعد میں اس کا منکر ہو گیا ہو، جسے اصطلاح میں مرتد کہا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی۔ البتہ اگر اس مرتد شخص نے کلمہ شہادت کے اقرار کے دوران واجب زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کی ہو تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک وہ وصول کی جائے گی، لیکن احناف کے نزدیک وصول نہیں کی جائے گی، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت نیت شرط ہے اور چونکہ مرتد کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، لہٰذا اس سے پہلے کی زکوٰۃ کی رقم وصول نہیں کی جائے گی۔ پھر اگر وہ مرتد شخص اللہ کی توفیق سے دوبارہ داخل اسلام ہو جائے تو اس ارتداد کے زمانہ کی زکوٰۃ اس سے وصول نہیں کی جائے گی۔

2- بالغ ہونا:

زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے دوسری شرط انسان کا بالغ ہونا ہے؛ کیونکہ اللہ عزوجل نے اپنے نابالغ بندوں کو جنھیں عقل و شعور نہیں ہوتی کسی کام کا مکلّف نہیں بنایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''**رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبى حتى يحتلم، وعن المجنون حتى يعقل**'' (ابوداؤد: 4403) (تین قسم کے افراد سے قلم اٹھالیا گیا ہے: ایک سونے والے شخص سے جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے، دوسرے بچے سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے، اور تیسرے پاگل شخص سے جب تک کہ اسے عقل نہ آجائے)۔ لہٰذا جب تک کوئی شخص بالغ نہیں ہو جاتا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔ البتہ مالکی، شافعی اور حنبلی مسالک میں نابالغ بچے پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، جسے اس کا ولی بچہ کی جانب سے ادا کرے گا، اور اگر بچہ کا ولی اس کی جانب سے زکوٰۃ نہیں کرتا ہے تو بالغ ہونے کے بعد بچہ پر گذشتہ تمام مدت کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہوگی۔

3- عاقل ہونا:

زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ عقل و شعور کے اعتبار سے درست ہو۔ اس سلسلہ میں اوپر حدیث پیش کی جا چکی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص پاگل اور مجنون ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔ البتہ پاگلپن کے سلسلہ میں اس قدر تفصیل ہے کہ اگر یہ کیفیت وقفہ وقفہ سے طاری ہوتی ہو اور دیگر شرطیں پائی جاتی ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی، لیکن اگر یہ مرض دائمی ہو تو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی۔ تاہم اگر کوئی شخص بے ہوش خواہ سال بھر سے ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ اس سلسلہ میں الگ رائے رکھتے ہیں ان کے نزدیک اس شرط کا اعتبار نہیں ہے، مجنون اور پاگل شخص پر بھی زکوٰۃ فرض ہوگی اور اس کی جانب سے اس کا ولی زکوٰۃ کی ادائیگی کرے گا۔

4- آزاد ہونا:

زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے انسان کا آزاد ہونا شرط ہے؛ کیونکہ غلام شخص کا مال اس کے مالک ہی کی ملکیت شمار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص صاحب مال ہی نہیں تو اس پر زکوٰۃ کا وجوب کیونکر ہو سکتا ہے۔

3.6 مال سے متعلق شرطیں

اوپر آپ نے زکوٰۃ کی فرضیت سے متعلق صاحب مال کی شرطوں کو جانا۔ اب یہاں پر مال سے متعلق شرطوں پر روشنی ڈالی جارہی ہے:

1-ملکیت:

ملکیت سے مراد یہ ہے کہ جب تک مال پر کسی انسان کو مکمل قبضہ اور تصرف کا اختیار حاصل نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ لہٰذا ایسا مال جسے کسی نے بطور قرض کسی سے لیا ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ اس میں اگر چہ اسے تصرف کا حق حاصل ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے۔ اسی طرح ایسا مال جو دو یا چند افراد کے درمیان مشترک ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، تا آنکہ وہ سارے افراد اپنے اپنے حصہ کے مالک بن جائیں اور انھیں ان پر تصرف کی آزادی حاصل ہو جائے۔ اس مال پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جس پر کسی نے زبردستی قبضہ (غصب) کر لیا ہو، یا چوری ہو گیا ہو، یا جسے کسی کے پاس بطور امانت رکھا گیا ہو لیکن جس کے پاس امانت رکھا گیا تھا وہ اس کا انکار کر رہا ہو۔ بیویوں کے مہر پر بھی جب تک کہ انھیں اس پر قبضہ حاصل نہیں ہو جاتا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ امانت میں رکھی ہوئی ایسی مالیت جس کے واپس ملنے کی قوی امید ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یہی حکم بینک میں جمع شدہ مال کا ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ فکس ڈپازٹس ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کو بطور قرض کچھ رقم دیا ہو تو کیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ اس قرض دی گئی رقم کو ہم بنیادی طور پر چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں: پہلی قسم میں مثلاً آپ نے کسی کو قرض دیا، لیکن وہ اس کا انکار کرتا ہو، اور آپ کے پاس اپنی بات کی تائید میں کوئی ثبوت یا گواہ موجود نہ ہو، تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ دوسری قسم آپ نے کسی کو قرض دیا، اور وہ اس کا انکار کرتا ہو، لیکن آپ کے پاس اپنی بات کی تائید میں ثبوت اور گواہ موجود ہوں، تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ تیسری قسم مثلاً آپ نے کسی کو قرض دیا، جس کا وہ شخص اقرار بھی کرتا ہے، لیکن اس قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہے، اور آپ کو نہیں معلوم کہ وہ رقم آپ کو واپس کب ملے گی۔ ایسی صورت میں جب تک قرض میں دی گئی رقم حاصل نہیں ہو جاتی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ حاصل ہو جانے کے بعد جب ایک سال گذر جائے تو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔ چوتھی قسم آپ نے کسی کو قرض دی، جس کا اقرار قرض لینے والے شخص کو بھی ہے، لیکن وہ شخص بہت تنگ دست ہے وہ قرض کی رقم واپس لوٹا نہیں سکتا، یا اس کا دیوالیہ ہو گیا اور عدالت نے اسے مفلس قرار دے دیا ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں ہوگا۔ اور اگر مستقبل میں کبھی وہ قرض کی رقم مل جائے تو سال گذرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔

2-حاجت اصلیہ سے زائد:

زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو۔ حاجت اصلیہ سے مراد ایسے سامان ہیں جو انسان کے روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں، مثلاً رہنے کا گھر، پہننے کے کپڑے (اس میں سردی اور گرمی سے محفوظ رکھنے والے دونوں طرح کے کپڑے شامل ہیں، خواہ وہ کتنے ہی قیمتی ہوں)، خانہ داری کا سامان، سواری کا جانور یا گاڑیاں، دستکاروں کے اوزار، علمی کتابیں جن کا مطالعہ کیا جاتا ہو، حفاظت کے ہتھیار، آرائش وزیبائش کے برتن اور دیگر سامان خواہ وہ کتنے ہی قیمتی ہوں اور ان میں جواہرات، موتی اور یاقوت وزمرد جڑے ہوں لیکن ان پر زکوٰۃ نہیں۔ ہاں البتہ اگر ان میں سے کسی چیز میں سونے یا چاندی کی آمیزش ہو، اور وہ اتنی مقدار میں ہو کہ اگر اس کو الگ کیا جائے تو وہ نصاب کو پہنچ جائے، یا اسے اور دیگر تجارتی اموال اور نقدی ملانے سے نصاب کو پہنچ جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ سونا چاندی کے علاوہ دیگر چیزیں اگر تجارت کی غرض سے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن اگر ان میں تجارت کی نیت ہو تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ کرائے پر دیئے جانے والے سامانوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے بعض مکانات، گاڑیاں یا دیگر استعمال کی چیزیں لوگوں کو کرائے پر دیتا ہو تو ان پر زکوٰۃ نہیں۔ ہاں البتہ ان سے حاصل ہونے والے منافع اگر بقدر نصاب ہوں اور اس پر سال گذر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

3-مال نامی:

مال نامی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں اضافہ اور بڑھوتری ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے سامان جو کرائے پر دیئے جاتے ہیں ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، بلکہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ مال میں بڑھوتری عموماً دو طریقوں سے ہوتی ہے: خِلقی اور فعلی۔ خِلقی یعنی معنوی اعتبار سے سونا اور چاندی میں اضافہ ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ اپنی ذات میں اضافہ نہیں ہوتے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کی قیمتوں میں ہر دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے سونا چاندی خواہ تجارت کی غرض سے ہو یا زیورات کی شکل میں اپنے استعمال کے لئے، اگر ان میں دیگر شرطیں پائی جاتی ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فعلی یعنی جن چیزوں کے اضافہ میں انسانی عمل اور کوشش کو دخل ہوتی ہے، جو سونا اور چاندی کے علاوہ دیگر چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا سونا اور چاندی کے علاوہ میں مال نامی کی شرط اس طور پر پوری ہوتی ہے کہ وہ حوائج اصلیہ سے زائد ہوں اور ساتھ ہی ان میں تجارت کی نیت بھی ہو۔

4-سال کا گذرنا:

کسی بھی مال پر زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس پر ایک سال گذر جائے۔ یعنی کوئی شخص شریعت کے متعین کردہ مقدار کے بقدر مال کا مالک ہوا اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔ سال گذرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے پاس سال کے ایک سرے میں 50 ہزار روپئے تھے، پھر درمیان سال میں اس میں کچھ کم آ گئی اور وہ 30 ہزار باقی رہ گیا، لیکن پھر آخر سال میں وہ دوبارہ 50 ہزار روپئے کا مالک ہو گیا تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور درمیان سال میں آنے والی کمی کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، اسے زکوٰۃ کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ لیکن اس کے برخلاف درمیان سال میں اس 50 ہزار میں اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ باقی رہتا ہے یا اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو آخر سال میں جو مال اس کے پاس ہوگا اسی کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ کی ادائیگی کی جائے گی۔ یعنی درمیان سال میں اضافہ ہونے والے مال کے لئے الگ سے نیا سال نہیں گذرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ اضافہ ہونے والا مال پہلے سے موجود مال کی جنس سے ہو۔ لیکن اگر اضافہ ہونے والے مال کی جنس مختلف ہو مثلاً پہلے سے سونا چاندی موجود تھے، لیکن بعد میں اسے بطور مال اونٹ یا گائے یا بکری اضافہ ہوا تو اس کے لئے الگ سے سال گذرنے کا انتظار کیا جائے گا۔

سال گذرنے کی یہ شرط سونا، چاندی، نقد رقم، تجارتی سامانوں اور مویشیوں وغیرہ سے متعلق ہے۔ لیکن ایسی چیزیں جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً اناج اور پھل پھول وغیرہ ان کے لئے سال گذرنے کی شرط نہیں ہے، بلکہ ان کے متعلق شریعت کا یہ حکم ہے کہ جس دن ان کی کٹائی ہو اسی دن ان کی زکوٰۃ (عشر) ادا کر دی جائے۔ (انعام:141)

5-نصاب:

زکوٰۃ کے وجوب کے لئے مال کا شریعت کی متعین کردہ مقدار میں ہونا لازمی ہے، اس کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں شریعت نے مختلف چیزوں کی مقدار جسے اصطلاح میں نصاب کہا جاتا ہے الگ الگ متعین کی ہے۔ اس باب میں سب سے اہم سونا اور چاندی ہیں، جن میں سونا کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ مقرر ہے جو موجودہ اوزان کے مطابق سونا 87 گرام اور چاندی 612.35 گرام ہوتی ہے۔ اگر ان اوزان کے بقدر سونا یا چاندی کسی کے پاس موجود ہو اور زکوٰۃ کی دیگر شرطیں بھی پائی جاتی ہوں تو اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگا۔ نقد رقم اور تجارتی اشیاء وغیرہ میں ان ہی دونوں کے نصاب کا اعتبار کیا جاتا ہے، چنانچہ اگر ان چیزوں کی قیمت سونا چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اور ان کا چالیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔

زرعی پیداوار یعنی زمین سے پیدا ہونے والی اجناس مثلاً چاول، گیہوں، چنا، ترکاریاں، سبزیاں اور ہر طرح کا غلہ پر شریعت نے زکوٰۃ جسے عشر کہا جاتا ہے مقرر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر پیداوار کی سیرابی اور سینچائی میں انسان کی محنت کا زیادہ رول رہا ہو تو اس میں سے پانچ فیصد بطور عشر ادا کیا جائے گا، لیکن اس کے برعکس اگر اس کی سینچائی قدرتی طریقہ سے یعنی بارش کے پانی سے ہوئی ہو تو عشر کے طور پر پیداوار کا دس فیصد ادا کرنا ہوگا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ زمین سے پیدا ہونے والی ان اجناس پر شریعت کی جانب سے کم سے کم کی کوئی تحدید نہیں ہے، بعض فقہاء کے نزدیک اس کی کم سے کم مقدار 653 کلوگرام کا وزن ہے۔ پہاڑوں سے حاصل ہونے والے شہد میں بھی زکوٰۃ نکالنا لازمی ہے، اس کا بھی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں نکالا جائے گا۔

زمین سے نکلنے والی معدنی اشیاء مثلاً سونا، چاندی، لوہا، چونا، تانبا، پارہ وغیرہ پر شریعت نے بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ اللہ کی راہ میں نکالنا فرض کیا ہے۔ جس طرح زرعی پیداوار کے لئے سال کا گذرنا اور مقدار کی کوئی شرط نہیں ہے اسی طرح معدنی اشیاء بھی ان دونوں شرطوں سے آزاد ہیں، لہٰذا زمین سے جو بھی معدنی اشیاء دستیاب ہوں ان میں بیسواں حصہ نکالنا لازمی ہوگا۔ یہی حکم زمین کے اندر محفوظ کئے گئے دفینوں کا ہے۔ اگر کسی کو دفینہ ملیں تو ان کا بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالا جائے گا۔

جانوروں میں شریعت نے کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے الگ الگ نصاب مقرر کئے ہیں، اور ان کی مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً پہلا قسم کے مویشیوں میں اونٹ ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے کم سے کم تعداد پانچ ہے۔ اگر کسی کے پاس پانچ اونٹ ہوں تو اس پر ایک سال کی ایک بکری بطور زکوٰۃ واجب ہوگی۔ گائے، بیل اور بھینس ایک جنس کے جانوروں میں ہیں، جس کے پاس ان کی کم سے کم تعداد تیس پہنچ جائے تو ان پر ایک سال کا ایک بچھڑا زکوٰۃ کے نام پر دینا لازمی ہوگا۔ اسی طریقہ سے بکرا، بکری، کھسی، بھیڑ اور دنبہ ایک قسم کی جانور میں شامل ہیں۔ ان کی کم سے کم تعداد چالیس ہونے پر ایک بکری بطور زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کی تفصیل فقہ کی کتابیں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

3.7 مصارف زکوٰۃ

مصارف، مصرف کی جمع ہے جس سے مراد ایسے مسلمان ہیں جن کو زکوٰۃ کی رقم دینا درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے آٹھ قسم کے افراد کی نشاندہی کی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

> **''انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله، والله عليم حكيم''**۔(توبہ:60)
>
> (زکوٰۃ غریبوں، حاجت مندوں، صدقہ وصول کرنے پر متعین کارکنوں، وہ لوگ جن کی دل جوئی مقصود ہو، غلاموں، مقروضوں، اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کا حق ہے، یہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ خوب جاننے والے اور حکمت والے ہیں)۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے مصارف زکوٰۃ کی تعیین کر دینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ کے مال دوسری صدقات اور عطیات سے مختلف ہے، لہٰذا زکوٰۃ کے مال صرف انھیں لوگوں کو دیئے جائیں جن کی تعیین اللہ تعالیٰ نے خود فرما دی ہے۔ آیئے ان مصارف کو کسی قدر تفصیل سے جانتے ہیں:

1،2- فقراءومساکین:

فقہائے کرام نے فقراءاور مساکین کی جوتعریف کی ہے وہ ایک دوسرے سے ملتی ہے۔ایک قول کے مطابق فقراء وہ ہیں جن کے پاس اپنی روزانہ کی زندگی گذارنے کے لئے کچھ نہ ہو،اور مساکین وہ ہیں جن کے پاس گذر بسر کی ضروری چیزیں موجود ہوں۔دوسرے قول کے مطابق فقراء وہ ہیں جن کے پاس گذر بسر کی ضروری چیزیں مہیا ہوں،اور مساکین وہ ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔البتہ زیادہ صحیح پہلا قول معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے فقراء کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقراءزیادہ ضرورت ہیں۔اس کے علاوہ سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:''**اما السفینة فکانت لمساکین یعملون فی البحر** ''(آیت:79)یعنی کشتی مساکین کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے۔اس آیت سے بھی پتا چلتا ہے کہ مساکین وہ ہیں جن کے پاس زندگی گذارنے کی ضروری چیزیں پہلے سے موجود ہوں۔علاوہ ازیں آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرتے وقت نصیحت فرمائی تھی کہ زکوٰۃ کے مال اغنیاء سے لئے جائیں گے اور فقراء میں تقسیم کئے جائیں گے۔رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی فقراء کی ضرورتمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔بہرحال فقراء اور مساکین مصارف زکوٰۃ میں ہیں،یعنی ایسے افراد جن کو زکوٰۃ کی رقم دینا شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔

3- عاملین:

عاملین سے مراد ایسے افراد ہیں جو زکوٰۃ سے متعلق کاموں میں مشغول ہوں،جن کو امام المسلمین کی جانب سے متعین کیا گیا ہو۔اس ضمن میں امیروں سے زکوٰۃ وصول کرنے والے،مستحقین تک پہنچانے والے اور ان تمام کاموں کا حساب وکتاب رکھنے والے سبھی افراد شامل ہیں۔اس ضمن میں مدارس کے ان عاملین کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔یہ عاملین اگرچہ فقراء ومساکین میں سے نہ ہوں،جن کے لئے دراصل شریعت نے زکوٰۃ کی رقم لینے کی اجازت دی ہے،لیکن اس کے باوجود وہ زکوٰۃ کی رقم میں سے لے سکتے ہیں، کیونکہ درحقیقت وہ اپنے کام کا معاوضہ لے رہے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ عاملین کے اجرت یا معاوضہ کے طور پر دی جانے والی رقم کی تعیین نہیں کی گئی ہے۔البتہ اس سلسلہ میں ائمہ کرام کے مختلف اقوال مروی ہیں۔احناف کے نزدیک ان کو ان کے عمل کے بقدر بطور اجرت دی جائے،شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک امام المسلمین کو اختیار ہے کہ وہ ان کے لئے ایک اجرت متعین کردے۔

4- مؤلفۃ القلوب:

زکوٰۃ کے اس مصرف کے مطابق زکوٰۃ کی رقم ایسے لوگوں کو بھی دینا درست ہے جنہیں اسلام اور مسلمانوں سے جوڑنا مقصود ہو۔مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس ضمن میں تین قسم کے افراد آتے ہیں: پہلی قسم میں ایسے غیر مسلم افراد ہیں جن کے متعلق یہ امید ہو کہ اگر ان کی مالی اعانت کی گئی تو وہ داخل اسلام ہو جائیں گے تو ان کی مالی مدد کی جاسکتی ہے۔دوسری قسم کے افراد میں ایسے غیر مسلم امراء وروساء ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ ہو اور یہ امید ہو کہ اگر ان کو کچھ پیسے وغیرہ دے دیئے جائیں تو ان کے فتنوں اور شرانگیزیوں سے بچا سکتا ہے تو ایسے افراد کو بھی زکوٰۃ کے پیسے دیئے جاسکتے ہیں۔تیسری قسم کے افراد وہ ہیں جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہوں،اور ان کا ایمان کچھ کمزور ہو،اور یہ امید ہو کہ اگر ان کی مالی مدد کی گئی تو وہ ایمان میں ثابت قدم ہو جائیں گے۔تو ایسے افراد کی بھی زکوٰۃ سے مدد کی جاسکتی ہے۔

البتہ اس مد کے باقی رہنے یا ختم ہو جانے کے سلسلہ میں ائمہ کے مختلف آراء ہیں۔حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہ مد ختم ہو چکا ہے، کیونکہ اب اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے اور مسلمانوں کی آبادی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔چنانچہ عہد خلافت راشدہ ہی میں اس مصرف پر زکوٰۃ

کا مال خرچ نہ کئے جانے پر تقریباً تمام صحابہ کا اتفاق ہو چکا تھا۔ دوسری رائے حنابلہ کی ہے۔ ان کے مطابق یہ مصرف باقی ہے اور جب ضرورت درپیش ہو تو اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ موجودہ حالات کے مناسبت سے یہ دوسری رائے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

5- غلام کی آزادی:

غلام کی آزادی میں تین طرح کے افراد شامل ہیں: پہلی قسم میں ایسے مسلمان غلام ہیں جو پورے طور پر غلام ہوں، تو زکوٰۃ کے پیسے سے ان کو آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ دوسری قسم میں ایسے مسلمان غلام ہیں جنہوں نے اپنے مالکان سے کچھ پیسوں کے عوض اپنی آزادی خرید لی ہو یعنی خود آزاد کرالیا ہو، لیکن وہ اس معاوضہ کے پورے پیسوں کے انتظام کر پانے پر قادر نہ ہوں۔ تو زکوٰۃ کی پیسوں سے ایسے غلاموں کی آزادی میں مدد کی جائے گی۔ تیسری قسم میں ایسے افراد شامل ہیں جو غیر مسلموں کی قید خانوں میں بلا جرم قید ہوں۔ تو ان کی آزادی کے لئے بھی زکوٰۃ کے پیسے خرچ کئے جاسکتے ہیں۔

6- غارمین:

غارمین ایسے افراد کو کہتے ہیں جو مقروض (جس نے کسی سے لیا ہو) ہو، اور ایسے افراد کو بھی کہتے ہیں جو قرض دہندہ (قرض دینے والا) ہو۔ ان دونوں معانی میں غارمین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ غارمین کے لفظ سے اگر مقروض مراد لیا جائے تو اس کا مطلب صاف ہے کہ اس نے دوسروں سے قرض لیا تھا لیکن اب اس کی ادائیگی کی استطاعت نہ ہو۔ تو ایسے شخص کی زکوٰۃ کی مال سے مدد کی جائے گی تا کہ وہ اپنا قرض ادا کر سکے۔ اور اگر غارمین سے قرض دہندہ مراد لیا جائے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ ایک شخص جس نے اگر چہ دوسروں کو قرض دیا ہے لیکن اب ان سے انھیں وصول کر پانے پر قادر نہیں ہے تو ایسے شخص کی بھی زکوٰۃ سے مالی تعاون کی جائے گی۔ اس ضمن میں ایسے لوگ بھی شامل ہوں گے جنہوں نے دو افراد یہ چند لوگوں کے باہمی جھگڑے کو سلجھانے کے لئے کچھ مالی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہو، تو ایسے لوگوں کی بھی زکوٰۃ کے مال سے مدد کی جاسکتی ہے۔

7- فی سبیل اللہ:

زکوٰۃ کے اس ساتواں مصرف 'فی سبیل اللہ' یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے تین مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا پہلا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا ضرورت مند شخص ہے جس کے پاس آلات جہاد نہ ہوں اور اس کی وجہ سے دوسرے مجاہدین کے ساتھ وہ جہاد میں جانے سے پیچھے رہ جا رہا ہو تو زکوٰۃ کی رقم سے اس کی مدد کی جائے گی اور جہاد کے سامان اسے فراہم کئے جائیں گے۔ ایک رائے کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم مطلق ہے، لہٰذا جہاد کی تیار کے لئے زکوٰۃ کی رقم عمومی طور پر دی جاسکتی ہے۔ ایک اور رائے کے مطابق زکوٰۃ کی یہ رقم ان لوگوں کو نہیں دی جاسکتی جن کا وظیفہ حکومت کی جانب سے مقرر ہو، ان افراد کے علاوہ دوسری تمام لوگوں کو دی جاسکتی ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جس پر حج فرض ہوا تھا، لیکن اس وقت وہ حج نہ کر سکا، پھر بعد میں وہ حج کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، تو ایسے افراد کی بھی حج پر جانے کے لئے زکوٰۃ کی رقم سے مدد کی جائے گی۔ اس کا ایک اور مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے وہ طلبہ بھی مراد ہیں جنہوں نے علوم دینیہ کے حصول کے لئے اپنے گھر بار کو خیر باد کہہ دیا ہو، تو ایسے طلبہ کی بھی زکوٰۃ کی رقم سے مدد کی جاسکتی ہے۔

8- مسافر:

زکوٰۃ کے مصارف میں مسافر سے مراد ایسے لوگ ہیں جو سفر میں اپنے وطن اور مال واسباب سے دور ہوں اور حادثہ کی وجہ سے ان کے

مال ضائع ہوگئے ہوں۔تو ایسے مسافر کی زکوٰۃ کی رقم سے اعانت کی جاسکتی ہے،اگر چہ وہ اپنے وطن میں صاحب ثروت ہی کیوں نہ ہو۔البتہ بطور امداد اسے صرف اسی قدر زکوٰۃ کی رقم دی جائے گی جس سے وہ اپنے وطن پہنچ سکے۔مسافر کی اس قسم پر سبھی کا اتفاق ہے۔بعض لوگوں نے اس میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جن پر حج فرض ہوا لیکن وہ کسی وجہ سے اس وقت اس کی ادائیگی نہیں کر سکے،لیکن پھر بعد میں اس کی استطاعت نہ رہی،تو ایسے لوگوں کی بھی زکوٰۃ کے مال سے امداد کی جاسکتی ہے۔اس قسم کے افراد کا تذکرہ اوپر بھی آچکا ہے۔

3.8 بعض متفرق مسائل

- ادائیگی زکوٰۃ کے لئے بنیادی طور پر دو شرطیں ہیں۔پہلی شرط نیت ہے،نیت کرنے کے دو مواقع ہیں،پہلا موقع یہ ہے کہ زکوٰۃ مستحقین کے حوالہ کرتے وقت نیت کر لی جائے یا جس وقت زکوٰۃ کا مال دیگر اموال سے الگ کیا جائے اس وقت نیت کی جائے۔دونوں صورتوں میں زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہوگی۔دوسری شرط تملیک ہے،یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت جس مصرف زکوٰۃ کو زکوٰۃ کا مال دیا جارہا ہو اسے لازمی طور پر اس پر مالک بنا دیا جائے۔اگر زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی ایسی صورت ہو کہ جس میں مالک بنائے جانے کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو یا جس میں خود مالک بننے کی صلاحیت نہ ہو تو اس مد میں یا اس مصرف میں زکوٰۃ کی رقم نہیں لگائی جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ مساجد کی تعمیر اور رفاہی کاموں میں مثلاً سڑک،پل اور نہروں وغیرہ کی تعمیر میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا درست نہیں ہے۔
- زکوٰۃ ادا کرنے والے کو اختیار ہے کہ وہ مصارف زکوٰۃ کے ہر قسم کے لوگوں کو زکوٰۃ ادا کرے اور چاہے تو کسی ایک ہی پر اکتفاء کر لے۔دونوں صورتوں میں زکوٰۃ کی ادائیگی ہوگی۔
- زکوٰۃ کے رقم کسی ایک مستحق زکوٰۃ کو دے دینا افضل ہے،بشرطیکہ وہ بقدر نصاب سے کم ہو۔البتہ اگر مستحق زکوٰۃ بقدر نصاب سے زیادہ کا ضرورت مند ہو مثلاً اسے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہو،یا علاج کرانا ہو،یا وہ قرضدار ہو،یا اگر اس کا گھرانا بڑا تو بھی اسے نصاب کی مقدار سے زیادہ رقم دی جاسکتی ہے،بلکہ یہ افضل ہے،کیونکہ اس کے بعد اُسے دوسری جگہ سے لینے کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔
- زکوٰۃ دینے اور لینے والے کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس زکوٰۃ کی رقم سے مشترکہ طور پر فائدہ اٹھائیں۔چنانچہ اسی بنیاد پر اپنے والدین اور اولاد میں سے کسی کو زکوٰۃ کی رقم دینا درست نہیں ہے۔اسی طریقہ سے شوہر و بیوی کا ایک دوسرے کو دینا بھی درست نہیں ہے۔
- واجب زکوٰۃ کے علاوہ جو صدقات نافلہ ہیں ان سے عام لوگوں کی طرح بنو ہاشم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
- زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد کسی شخص نے تاخیر کی۔پھر زکوٰۃ ادا کر پانے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔تو اگر اس نے وفات سے پہلے زکوٰۃ ادا کر دینے کی وصیت کی ہو تو اس کے تمام مال کے ایک تہائی حصہ سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی،اور اگر مکمل زکوٰۃ ایک تہائی حصہ مال سے ادا نہ پائے تو وارثین کو اختیار ہوگا کہ وہ بقیہ مال سے اس کی زکوٰۃ کر دیں یا نہ کریں۔
- جانوروں پر زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ سائمہ ہو،یعنی اس جانور کی غذا سال کے اکثر حصوں میں زمین سے اگنے والے گھاس اور دیگر نباتات سے پوری ہوتی ہو۔لہٰذا اس کے برخلاف اگر کسی جانور کو گھر میں چارہ کھلایا جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔
- جانوروں کی زکوٰۃ میں اگر ایک ہی جنس کے مختلف جانور ہوں اور ان کو آپس میں ملانے سے زکوٰۃ کے نصاب مکمل ہو جاتا ہو تو ان کو آپس میں ملایا جائے گا،مثلاً کسی کے پاس 25 بکریاں اور 15 دنبہ ہوں تو ان دونوں کو ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا اور اس کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کی جائے گی۔

3.9 زکوٰۃ کی حکمت ومصلحت

زکوٰۃ کی ادائیگی کی مختلف حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔اس کی ادائیگی سے انسان کی ظاہری زندگی، روحانی زندگی اوراس کے ساتھ ہی پورے معاشرہ پراس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ذیل میں ان پر روشنی ڈالی جارہی ہے:

- ✯ جب ایک انسان زکوٰۃ کی ادائیگی کرتا ہےتو وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جس طرح اس نے اپنی محبوب شی ءاللہ کی راہ میں قربان کر دی ہے،اسی طرح وہ اپنی کسی بھی محبوب سے محبوب ترین چیزحتی کہ اپنی جان بھی اللہ کے حکم پر قربان کردینے سے دریغ نہیں کرے گا۔
- ✯ زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ اس کے اوپر اس کا حاکم و پروردگار ہے جس کے حکم عدولی وہ کسی بھی حال میں نہیں کرسکتا ہے۔ورنہ عموماً انسان کے پاس دولت آجانے کے بعد وہ احکام الٰہی کا نافرمان ہوجاتا ہے،اورفضول خرچیوں اوراپنی تعیش پسندیوں میں مال واسباب ضائع کرنے لگتا ہے۔
- ✯ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال کی صفائی ہوجاتی ہےاوروہ میل نکل سے پاک ہوجاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی اس کے ذریعہ مال میں برکت بھی حاصل ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:''**خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها**''۔(توبہ:۱۳)(مسلمانوں کے مالوں سے زکوٰۃ لیجیے،تاکہ اس کے ذریعہ آپ ان کا تزکیہ اورتطہیر کریں)۔
- ✯ زکوٰۃ کے ذریعہ انسان کا دل سخاوت اورفیاضی کی طرف مائل ہوتا ہے،بخل اور کنجوسی جیسی بری عادتوں سے نجات پاجاتا ہے۔اس کے علاوہ زکوٰۃ کے ذریعہ امانتوں کی ادائیگی اور مستحقین کے حقوق ان تک پہنچانے کی جانب بھی اس کا میلان بڑھ جاتا ہے۔
- ✯ زکوٰۃ کی ادائیگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے مال سے معاشرہ کے بہت سے ضرورت مندوں اورمحتاجوں کی کفالت ہوتی ہے۔جس سے وہ بہت سے غلط طریقوں کو ذریعہ معاش بنالینے پر مجبورنہیں ہوجاتے ہیں۔ورنہ بسااوقات ضرورتوں کی تکمیل نہ ہوپانے کی وجہ سے بہت سے لوگ خودکشی کرلیتے ہیں،کبھی انھیں مجبوراً دین وایمان کا سودا کرنا پڑتا ہے،اورکبھی چوری،ڈکیتی،سٹہ بازی اور جوا جیسے گناہ کے کاموں میں وہ ملوث ہوجاتے ہیں۔
- ✯ بسااوقات معاشرہ میں بعض افراد کے پاس کافی مال ودولت آجاتا ہے،اوروہ اسے ذخیرہ اندوزی کرکر کے رکھتا ہے۔جس سے معاشرہ کے افراد کے درمیان کافی نابرابری ہوتی ہے۔زکوٰۃ کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشرہ کی اس نابرابری کو کسی قدرختم کیاجائے۔
- ✯ کسی بھی معاشرہ میں امیروغریب ہرطرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی ضرورتیں آپس میں جڑی ہوتی ہیں۔زکوٰۃ کے ذریعہ ان کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں،ان کے درمیان محبت بڑھتی ہے،اوروہ ایک دوسرے کے کام آنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے۔
- ✯ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمارنعمتوں سے نوازا ہے۔انعام واکرام پرشکریہ بجالانا لازمی ہے۔اللہ تعالیٰ کی بے شمارنعمتوں کی طرح زکوٰۃ ادا کرنا بھی اللہ کے حضورایک شکرانہ ہے۔جس طرح نماز جسمانی نعمتوں کا شکرانہ ہےاسی طرح زکوٰۃ مالی نوازشات کا شکرانہ ہے۔

3.10 اکتسابی نتائج

- زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔
- کسی شخص پرزکوٰۃ فرض ہونے کے لئے چارشرطیں ہیں۔اگرکوئی شخص ان شرطوں کو پورا کررہا ہوگا تو اس پرزکوٰۃ فرض ہوجائے گی:

مسلمان ہونا، عاقل ہونا، بالغ ہونا، آزاد ہونا۔

- شریعت نے جن اموال کی زکوٰۃ مقرر کی ہے ان کی مختلف شرطیں ہیں، جن میں ملکیت کا پایا جانا، حاجت اصلیہ سے زائد ہونا، مال میں نمو یعنی بڑھوتری کا پایا جانا، سال کا گذرنا، اور نصاب کے بقدر ہونا شرط ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بھی شرط نہ پائی جائے تو زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی۔
- شریعت نے جن اموال پر زکوٰۃ لازم کیا ہے، ان میں سب سے اہم سونا اور چاندی ہے۔ کیونکہ انھیں دراصل کرنسی کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا نقد رقم اور تجارتی اشیاء وغیرہ میں انھیں دونوں کو معیار بنا کر زکوٰۃ کی ادائیگی کی جائے گی۔ سونا کا نصاب 87 گرام (ساڑھے سات تولہ) اور چاندی کا 612.35 گرام (ساڑھے باون تولہ) ہے۔ چنانچہ اگر نقد رقم یا تجارتی اشیاء ان میں سے کسی ایک کی قیمت کو پہنچ جائیں اور وہ ضرورت اصلیہ سے زائد بھی ہوں تو ان پر زکوٰۃ لازم ہو جائے گی۔
- سونا چاندی کے علاوہ شریعت نے زرعی پیداوار، معدنی اشیاء اور مویشیوں پر بھی زکوٰۃ مقرر کیا ہے۔
- ایسے افراد جن کو زکوٰۃ کی رقم دینا درست اور جائز ہے شریعت نے ان کی تعیین کر دی ہے، ان کو مصارف زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ ایسے افراد آٹھ قسم کے ہیں: فقراء، مساکین، عاملین، مؤلفۃ القلوب، غلام کی آزادی، غارمین، فی سبیل اللہ، مسافر۔
- زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے دو شرطیں ہیں، ان کے بغیر زکوٰۃ کی ادائیگی درست نہیں ہوتی: پہلی شرط نیت ہے اور دوسری جسے زکوٰۃ کا مال دے رہے ہیں اور مالک بنا دینا۔

3.11 نمونۂ امتحانی سوالات

3.11.1 معروضی سوالات:

1- درج ذیل میں سے ارکان اسلام میں کون نہیں ہے؟

(أ). نماز (ب). روزہ (ج). زکوٰۃ (د). قربانی

2- لغت میں زکوٰۃ کے کیا معنی نہیں ہے؟

(أ). پاکی (ب). بڑھوتری (ج). خرچ کرنا (د). سب غلط

3- رسول اللہ ﷺ نے یہ کن سے فرمایا تھا ''زکوٰۃ کا مال ان کے امیروں سے لیا جائے گا اور غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا''؟

(أ). حضرت ابو ہریرہؓ (ب). حضرت معاذ بن جبلؓ (ج). حضرت ابن مسعودؓ (د). حضرت سلمان فارسیؓ

4- اپنے عہد خلافت میں کس نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا تھا؟

(أ). حضرت ابو بکرؓ (ب). حضرت عمرؓ (ج). حضرت عثمانؓ (د). حضرت علیؓ

5- درج ذیل میں سے حوائج اصلیہ میں سے کون سا سامان ہے؟

(أ). کپڑے (ب). کتابیں (ج). زیبائش کے برتن (د). سب صحیح

6- سونا کا نصاب کتنا ہے؟

(أ). 87 گرام (ب). 612 گرام (ج). 90 گرام (د). 85 گرام

7- زمین سے نکلنے والی معدنی اشیاء کا کتنا حصہ بطور زکوٰۃ نکالا جائے گا؟

(اُ). چالیسواں حصہ (ب). بیسواں حصہ (ج). دسواں حصہ (د). نواں حصہ

8- مصارف زکوٰۃ کتنے ہیں؟

(اُ). دس (ب). سات (ج). آٹھ (د). چھ

9- درج ذیل میں سے کون مصارف زکوٰۃ نہیں ہے؟

(اُ). مجاہد (ب). غلام (ج). مسافر (د). والدین

10- زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کیا شرط ہے؟

(اُ). نیت کرنا (ب). مسلمان ہونا (ج). سال گذرنا (د). مال کا بقدر نصاب ہونا

3.11.2 مختصر جوابی سوالات:

1- زکوٰۃ کے معنی ومفہوم کو واضح کیجیے۔

2- زکوٰۃ کی اہمیت وفضیلت پر روشنی ڈالئے۔

3- صاحب مال سے متعلق شرطوں پر گفتگو کیجیے۔

4- ن صمال پر ملکیت پائے جانے اور حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تفصیل کے ساتھ تحریر کیجیے۔

5- زکوٰۃ کی حکمت ومصلحت پر ایک نوٹ لکھیے۔

3.11.3 طویل جوابی سوالات:

1- زکوٰۃ کے احکام ومسائل پر ایک جامع مضمون تحریر کیجیے۔

2- مال سے متعلق کیا شرطیں ہیں؟ مفصل لکھیے۔

3- مصارف زکوٰۃ پر ایک تفصیلاً نوٹ لکھیے۔

3.12 تجویز کردہ کتابیں

1- قاموس الفقہ (چوتھی جلد) : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

2- آسان فقہ (دوسری جلد) : مولانا محمد یوسف اصلاحی

3- مسائل رفعت قاسمی : مولانا محمد رفعت قاسمی

4- ارکان اربعہ : مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

5- مختصر القدوری (عربی) : شیخ احمد بن محمد القدوری

-:oOo:-

اکائی 4 : حج

اکائی کے اجزاء

4.1 تمہید

4.2 مقصد

4.3 حج کے معنی ومفہوم اور فرضیت

4.4 حج کی اہمیت وفضیلت

4.5 وجوب حج کی شرطیں

4.6 حج کے ارکان ومناسک

4.6.1 حج کے ارکان

4.6.2 حج کے واجبات

4.6.3 حج صحیح ہونے کی شرطیں

4.7 حج کے ممنوعات

4.8 حج کی قسمیں

4.9 حج کے میقات

4.10 حج بدل کے احکام

4.11 حج کے فوائد اور مصالح

4.12 اکتسابی نتائج

4.13 نمونۂ امتحانی سوالات

4.13.1 معروضی سوالات

4.13.2 مختصر جوابی سوالات

4.13.3 طویل جوابی سوالات

4.14 تجویز کردہ کتابیں

4.1 تمہید

اس اکائی میں حج سے متعلق اہم احکام ومسائل پر گفتگو کی جائے گی۔ زکوٰۃ کے معنی ومفہوم اور فرضیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اہمیت وفضیلت قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کی جائے گی۔ حج فرض ہونے کے لئے ضروری شرائط کا جائزہ لیتے ہوئے، اس کے ارکان، واجبات اور صحیح ہونے کی شرطوں کو بھی زیر بحث لایا جائے گا۔ ساتھ ہی اس کے ممنوعات پر بھی کلام کیا جائے گا۔ حج کی قسموں کی وضاحت کرتے ہوئے میقات یعنی احرام باندھنے کے مقامات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ حج بدل کے احکام اور حج کے فوائد ومصالح کے تذکرہ کے ساتھ اس اکائی کا خاتمہ ہوگا۔

4.2 مقصد

اس کا اکائی کا مقصد حج کے بنیادی احکام ومسائل سے طلبہ کو واقف کرانا ہے۔ احکام ومسائل کے ذیل میں اس کے معنی ومفہوم اور قرآن وحدیث میں اس کی فرضیت کے سلسلہ میں احکام سے متعلق معلومات حاصل ہوگی۔ ساتھ ہی وجوب حج کی شرطوں، ارکان، واجبات، صحیح ہونے کی شرطوں، ممنوعات حج، اقسام حج، میقات حج، حج بدل اور اس کے فوائد ومصالح سے بھی آگاہی ہوگی۔

4.3 حج کے معنی ومفہوم اور فرضیت

اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کے بعد جن کاموں کو کرنے کا ہمیں لازمی طور پر پابند بنایا، ان میں ایک حج ہے۔ لغوی اعتبار سے حج کے معنی ارادہ اور قصد کرنے کے ہیں (لسان العرب، ج:2، ص:226)، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ''حج زید فلاناً'' یعنی زید فلاں شخص کی زیارت کے ارادہ سے گیا۔ شریعت کی اصطلاح میں بعض خاص دنوں میں، خاص طرح کے لباس وپوشاک میں بعض مخصوص مقامات مثلاً خانہ کعبہ، منی، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ کی زیارت کرنا اور اس دوران شریعت کے دیئے گئے احکام پر عمل کرنا حج ہے۔ اس مفہوم میں قرآن کریم میں متعدد آیتیں ملتی ہیں جو حج کے اس معنی ومفہوم کی پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی فرضیت کو بھی ثابت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً''۔ (آل عمران:97)

(جو لوگ اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتے ہیں، ان پر اس کا حج فرض ہے)۔

دوسری جگہ سورہ حج کی آیت نمبر 27 میں فرماتے ہیں:

''وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ''۔

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، تمہارے پاس لوگ پیدل اور اونٹنیوں پر دور دراز راستے سے پہنچیں گے)۔

اور سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اللہ کے لئے حج اور عمرہ کریں، آیت ہے:

''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ''۔(البقرۃ:196)

قرآن کریم کی ان آیتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو بھی شخص اللہ کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے، اس پر حج فرض ہے۔قرآن کریم میں ان کے علاوہ بھی بکثرت آیتیں ہیں جو اس کی فرضیت پر دلالت کرتی ہیں۔ذخیرہ احادیث میں بھی بکثرت ایسی روایتیں ملتی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے حج کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔آنحضور ﷺ نے اسے ارکان اسلام میں سے قرار دیا ہے، یعنی جن بنیادوں پر اسلام کی عمارت قائم ہے ان میں سے ایک حج ہے۔اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:''**بنی الاسلام علی خمس: شهادة أن لا اله الا الله وأن محمداً رسول الله، واقام الصلاة، وايتاء الزكاة، والحج، وصوم رمضان** ''(بخاری:8)یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے:اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد [ﷺ] اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ایک مرتبہ آپ ﷺ نے لوگوں کو خطاب فرمایا اور کہا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا اسے ادا کیا کرو:

''**عن ابی هريرة، قال: خطبنا رسول الله ﷺ، فقال: أيها الناس قد فرض الله عليكم الحج، فحجوا**''۔(مسلم:1337)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو، ہوسکتا ہے کہ یہ میرا آخری حج ہو:

''**يا ايها الناس! خذوا مناسككم، فانی لا أدری لعلی لا احج بعد عامی هٰذا**''۔(سنن نسائی:3062)

(اے لوگو! مجھ سے اپنے حج کے افعال وارکان سیکھ لو، ہوسکتا ہے کہ اس سال کے بعد میں حج نہ کر سکوں)۔

جس شخص پر حج فرض ہو چکا ہو، تو اسے حج کی ادائیگی میں سستی نہیں کرنی چاہئے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ:

''**من اراد الحج، فليتعجل، فانه قد يمرض المريض، وتضل الضالة، وتعرض الحاجة**''۔(سنن ابن ماجہ:2883)

(حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص حج کا ارادہ کرے اسے جلدی کرنا چاہئے کیونکہ کبھی آدمی بیمار ہو جاتا ہے، سواری کا بندوبست نہیں ہوسکتا یا کوئی رکاوٹ پیش آجاتی ہے)۔

شریعت نے استطاعت رکھنے والے شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض کیا ہے۔چنانچہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے ایک مجلس میں صحابہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا بیت اللہ کی زیارت کی استطاعت رکھنے والے شخص کو حج کر لینا چاہئے۔کسی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ ہر سال ہے۔اللہ کے رسول ﷺ خاموش رہے، اس نے اپنا سوال تین مرتبہ دہرایا، لیکن آپ ﷺ خاموش

رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ تم پر ہر سال لازم ہو جاتا۔ (مسلم: 1337) لہٰذا اگر کوئی شخص ایک مرتبہ فرضیت کی ادائیگی کے بعد مزید حج کرتا ہے تو وہ اس کی جانب سے نفل ہوگا۔ حج خواتین پر بھی فرض ہے، لیکن ان پر حج کی فرضیت کے لئے مردوں کی شرطوں کے علاوہ مزید بعض شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے، اور ان شرطوں کے نہ پائے جانے کی صورت پر ان پر حج فرض نہیں ہوگا۔ ان کی تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔

4.4 حج کی اہمیت وفضیلت

اوپر گذر چکا ہے کہ حج اسلام کے ارکان میں سے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے ان امور میں سے قرار دیا ہے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اسلام کی اِس بنیاد اور رکن کا منکر ہو جائے تو اس کے اسلام کی عمارت گر جائے گی، اور وہ دائرہ اسلام سے خارج چلا جائے گا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں حج سے متعلق بکثرت آیتیں آئی ہیں جو انسانوں کو حج کی ادائیگی کی ترغیب دلاتی ہیں اور ساتھ ہی اس کی ادائیگی نہ کرنے پر مختلف سزاؤں سے بھی ڈراتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص حج ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور اس پر حج کی ادائیگی فرض ہو جائے، لیکن وہ اس کی ادائیگی نہ کرے تو اس کی ذرا بھی پرواہ نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ تو سارے جہاں سے بے نیاز ہے۔

''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً، وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ''۔ (آل عمران: 97)

(جو لوگ اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتے ہیں، ان پر اس کا حج فرض ہے، اور جو انکار کرے تو یقیناً اللہ پوری دنیا سے بے نیاز ہیں)۔

ایک اور دوسرے موقع پر حج کی ادائیگی کا شوق اور جذبہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ لوگوں میں حج کا اعلان کر دیں، تاکہ وہ دور دراز علاقوں سے پیدل اور اونٹنیوں پر سوار ہو کر آپ ﷺ کے پاس چلے آئیں، اور ان چیزوں کا مشاہدہ کر لیں جو ان کے حق میں مفید ہیں، اور ان مخصوص ایام میں چوپایوں کی شکل میں اور دوسری نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کی ہیں ان پر اللہ کی تسبیح بیان کر لیں، اور پھر وہ ان نعمتوں سے خود بھی کھائیں اور مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلائیں۔

''وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ، لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ''۔ (حج: 28-27)

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، تمہارے پاس لوگ پیدل اور دور دراز راستے سے پہنچیں گے، تاکہ وہ اپنے فائدہ کی جگہوں کو پہنچیں اور اللہ نے انھیں جو چوپائے دیئے ہیں، مقررہ دنوں میں ان پر اللہ کا نام لیں [یعنی قربانی کے ایام میں ان کی قربانی کریں] لہٰذا اس میں سے تم بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ)۔

اس قسم کی بکثرت آیتیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ ذخیرہ احادیث میں بھی اس سلسلہ میں مختلف روایتیں ملتی ہیں، جو متنوع انداز وبیان کے ساتھ آئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حج کی اہمیت وفضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص پر حج فرض ہو جائے، پھر کوئی سخت مجبوری یا کوئی سخت بیماری یا کوئی ظالم بادشاہ بھی نہ ہو جو اسے حج کی ادائیگی سے روک دے، اور پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی، برابر ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص حج کرتا ہے اور حج کے دوران کسی بھی طریقہ سے اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے وہ اپنی پیدائش کے دن گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔ ایک اور روایت میں اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ حج کا بدلہ صرف جنت ہی ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارا خیال ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا سب سے افضل عمل ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے افضل جہاد حج مبرور ہے۔ ذیل میں ان روایتوں کو پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ طلبہ کے سامنے حج کی اہمیت وفضیلت اچھی طرح واضح ہو جائے:

''عن ابی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: من حج فلم يرفث، ولم يفسق، رجع كهيئته يوم ولدته أمه''۔ (مسند احمد:7136)

(جس نے حج کیا اور پھر اس دوران اس نے نہ کوئی شہوت کی بات کی اور نہ اللہ کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو وہ تمام گناہوں سے اس طرح پاک صاف ہو گیا، جس طرح وہ اس دن تھا، جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا)۔

''عن ابی أمامة، قال: قال رسول الله ﷺ: من لم يمنعه من الحج حاجة ظاهرة أو مرض حابس، أو سلطان جائر، فمات ولم يحج، فليمت يهودياً أو نصرانياً ''۔ (حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ج:9، ص:251)

(حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو کوئی کھلی مجبوری، یا کوئی سخت مرض، یا کوئی ظالم بادشاہ نہ روکے، اور وہ حج کئے بغیر مر گیا تو چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے)۔

''عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ: تابعوا بين الحج والعمرة، فانهما ينفيان الفقر والذنوب كما ينفى الكير خبث الحديد، والذهب، ولفضة، وليس للحجة المبرورة ثواب الا الجنة''۔ (ترمذی:810)

(حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو، یہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل کو صاف کر دیتی ہے، اور حج مبرور کا ثواب تو جنت سے کم ہے ہی نہیں)۔

''عن ابی هریرةؓ: ان رسول الله ﷺ قال: العمرة الی العمرة کفارة لما بینهما، والحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة''۔(بخاری:1773)

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عمرہ ان تمام گناہوں کا کفارہ ہے جو موجودہ اور گزشتہ عمرہ کے درمیان سرزد ہوئے اور حج مبرور کا بدلہ تو جنت ہی ہے)۔

''عن عائشة ام المؤمنین رضی الله عنها، انها قالت: یا رسول الله، نری الجهاد أفضل العمل، أفلا نجاهد؟ قال: لا، لکن افضل الجهاد حج مبرور''۔(بخاری:1520)

(ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد سب نیک اعمال سے بڑھ کر ہے، تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ [تمہارے لئے] عمدہ جہاد حج مبرور ہے)۔

شریعت نے انسانوں پر جن عبادتوں کو لازم کیا ہے، اور ان کی جتنی صورتیں بتائی ہیں، حج دراصل ان تمام کا جامع ہے۔ اس میں نماز کی طرح ایک اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہے، بلکہ اِس میں اُس مسجد حرام میں سجدہ ریزی ہے، جسے تمام مسجدوں کی مرکزیت حاصل ہے، اور جو تمام مسجدوں میں افضل ہے، جس کے ارادہ سے سفر کرنے پر مستقل اجر وثواب کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ اس میں روزہ کی طرح محض اللہ کے حکم کی خاطر بہت سی جائز اور حلال چیزوں سے رک جانا ہے، اس میں زکوٰۃ کی طرح خالص اللہ کی رضا کے لئے اپنی محنت سے کمایا گیا مال خرچ کرنا بھی ہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ حج کے دوران خانہ کعبہ کے دیدار کے ساتھ طواف کی بھی سعادت حاصل ہوتی ہے، جو دراصل اس عبادت کے مشابہ ہے جو مقرب فرشتے عرش الٰہی کے گرد طواف کر کے ادا کر رہے ہیں۔

4.5 وجوب حج کی شرطیں

حج فرض ہونے کے لئے جن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے بعض شرطیں مرد وخواتین دونوں کے لئے یکساں ہیں، اور بعض دوسری شرطیں خواتین کے ساتھ خاص ہیں۔ ذیل میں پہلے ان شرطوں کو بیان کیا جا رہا ہے جو مرد وخواتین دونوں کے اندر یکساں طور پر پایا جانا ضروری ہے۔

1. مسلمان ہونا:

اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت کا پابند انہی لوگوں کو بنایا ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہوں۔ لہٰذا کسی بھی شخص پر حج فرض ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص حالت کفر میں حج کر لے تو اس کے حج کا کوئی اعتبار نہیں، اور اگر بعد میں وہ کلمہ شہادت کا اقرار کر لے تو اس پر حج کی ادائیگی لازم ہوگی۔ البتہ اگر کوئی شخص حالت کفر میں مالدار ہو اور اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے پاس اس قدر مال ودولت باقی نہ رہے کہ حج کا خرچ برداشت کر سکے تو حالت کفر میں اس کی مالداری کا اعتبار نہیں ہوگا۔ ہاں اگر وہ اسلام لانے کے بعد دوبارہ مالدار ہو جائے تو اس پر حج کی ادائیگی لازم ہوگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود اس سلسلہ میں وضاحت فرمادی ہے کہ:

''قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا لَّنْ یُّتَقَبَّلَ مِنْکُمْ ؕ اِنَّکُمْ کُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِیْنَ، وَمَا مَنَعَهُمْ

اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوۡلِهٖ''۔(توبہ:54-53)

(آپ[ﷺ] کہہ دیجیے کہ تم خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو یا ناگواری کے ساتھ، تم لوگوں سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، یقیناً تم لوگ نافرمان لوگ ہو۔ اوران کی خیرات کے قبول کرنے سے یہی بات رکاوٹ بنی ہے کہ وہ اللہ اوراس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے ہیں)۔

2. بالغ ہونا:

حج کی فرضیت کے لئے انسان کا بالغ ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نابالغ بندوں کو احکام شریعت سے آزاد رکھا ہے۔ اور آنحضورﷺ نے اس کی اس کی صراحت بھی فرمادی ہے کہ تین طرح کے لوگ احکام شریعت کے مکلّف نہیں ہوتے: پہلا وہ شخص جو سویا ہوا ہو، یہاں تک کہ وہ جاگ جائے، دوسری قسم نابالغ افراد، جب تک کہ وہ بالغ نہ ہوجائیں، اور تیسری قسم کے وہ افراد ہیں جن کی عقلوں میں فتور آ گیا ہو، یہاں تک کہ وہ عقل وشعور کے اعتبار سے صحت مند ہوجائیں، (ابوداؤد:4403)۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن میں کئے گئے حج کے متعلق فقہاء نے یہ وضاحت کی ہے کہ وہ نفلی حج قرار دیا جائے گا اور بالغ ہونے کے بعد دوسری شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں اس پر دوبارہ حج کرنا لازمی ہوگا۔

3. عاقل ہونا:

حج فرض ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان عقل وحواس کے اعتبار سے صحت مند ہو، تاکہ حج کے اعمال اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ انجام دے۔ دراصل شریعت نے ایسے شخص کو احکام الٰہی کا پابند ہی نہیں بنایا ہے جو پاگل اور مجنون ہو، اس بابت اوپر آنحضورﷺ کی حدیث آچکی ہے۔

4. آزاد ہونا:

غلام شخص پر حج فرض نہیں ہوتا۔ غلام دراصل خود کسی کی ملکیت ہوتا ہے، لہٰذا اس کے پاس جو کچھ مال واسباب ہوگا وہ بھی اس کے مالک کی ملکیت ہوگی۔ پھر غلام مستقل طور پر اپنے مالک کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی غلام شخص پر حج کی ادائیگی میں دو امور مانع ہیں، پہلا امر یہ ہے کہ وہ مالی اعتبار سے اس قابل نہیں ہے کہ حج کا خرچ برداشت کرسکے، اور دوسرا یہ کہ وہ ایسے کام میں مشغول ہے جس سے اسے چھٹی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے غلام شخص پر حج فرض نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غلام اپنے مالک کی اجازت سے حج کی ادائیگی کر بھی لے تو اس کی جانب سے یہ نفلی حج ہوگا، اور اگر وہ کبھی آزاد ہوتا ہے تو اس پر دوبارہ حج کی ادائیگی ضروری ہوگی۔

5. استطاعت:

حج میں اس شرط کے ضمن میں کئی چیزیں شامل ہیں، جو دراصل حج کے وجوب میں انسان کی طاقت وقدرت کے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جس پر انسان کو قدرت حاصل ہونی چاہئے وہ اس کی سواری ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایسی سواری کا انتظام نہیں کرسکتا جو اسے اس کے گھر سے مکہ مکرمہ لے کر جائے اور پھر وہاں سے واپس گھر لے کر آئے، تو اس پر حج فرض نہیں ہوگا۔ البتہ جو لوگ مکہ مکرمہ کے اردگرد بسے ہوئے ہیں اور وہ مسافت سفر (78 کیلومیٹر) کے اندر ہیں ان کے لئے یہ شرط نہیں ہے، لہٰذا اگر ان کے پاس سواری کا انتظام نہ ہو اور دوسری شرطیں ان کے اندر پائی جاتی ہوں تو ان پر حج فرض ہوگا۔ دوسری چیز توشہ اور زادِراہ ہے، اس سے مراد صرف کھانے پینے کی چیز نہیں ہے، بلکہ اس

کا مطلب یہ ہے کہ حاجی اتنا مالدار ہو کہ وہ اپنے گھر سے حج کے ارادہ سے نکلنے کے بعد واپس گھر آنے تک تمام طرح کے خرچ بہ آسانی برداشت کر لے۔ تیسرا امر یہ ہے کہ حج کے دوران حاجی کے پیچھے رہ جانے والے ایسے متعلقین اور رشتہ دار جن کے حقوق اور ذمہ داریاں حاجی کے ذمہ ہوں اور وہ انھیں حج کے دوران ادا کر پانے پر قادر ہو۔ گویاں ان تینوں امور اور تینوں صورتوں میں مالی اعتبار سے حاجی کا اس قدر مالدار ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنی سواری کا انتظام کر سکے، حج میں جانے اور واپس آنے کا پورا خرچ برداشت کر سکے، اور ساتھ ہی اس دوران اپنے پیچھے رشتہ داروں اور متعلقین کے حقوق کی ادائیگی بھی کر لے۔ یعنی اگر کوئی شخص اتنا مالدار نہ ہو کہ ان تینوں میں سے کسی ایک بھی صورت کا خرچ برداشت کر پانے پر قادر نہ ہو تو اس پر حج فرض نہیں ہوگا۔

استطاعت ہی کے ضمن میں حاجی کا جسمانی اعتبار سے صحت مند ہونا بھی شامل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ خود سواری پر سوار نہیں ہو پاتا ہو، یا اپاہج، مفلوج یا معذور ہو تو ان صورتوں میں اس پر حج فرض نہیں ہوگا۔ البتہ اگر اس کے اندر اتنی مالی وسعت اور قدرت ہو کہ کسی دوسرے کو بھیج کر حج بدل کرا سکتا ہو تو ایسا کرانا اس پر واجب ہوگا۔ یہ حج بدل اس کی جانب سے کافی ہو جائے گا، لیکن اگر وہ بیمار شخص بعد میں صحت مند ہو جائے اور اسے بیماری سے نجات مل جاتی ہے تو اس پر خود حج کرنا لازم ہوگا۔

اسی ضمن میں راستہ کا مامون ہونا بھی ہے۔ یعنی جس راستہ سے حاجیوں کا گذران ہو وہ پر امن ہو اور عام طور پر لوگ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ اپنی منزل تک اس راستہ سے پہنچ جاتے ہوں۔ اور اگر چہ کبھی اس راستہ میں کوئی حادثہ پیش آ بھی جائے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ تاہم اگر اس راستہ میں جنگ چڑھی ہوئی ہو، یا طاعون جیسی کوئی وبا پھیلی ہوئی ہو، یا کوئی بڑا حادثہ پیش آیا ہو اور اس راستہ سے گذرتے ہوئے جان و مال کا خطرہ ہو تو وہ راستہ پر امن نہیں مانا جائے گا، اور حج کی فرضیت اس راستہ کے لوگوں سے اس وقت تک ساقط ہو جائے گی جب تک کہ وہ راستہ پر امن ہونے کے حکم میں نہیں آ جاتا۔

اوپر گذر چکا ہے کہ وجوب حج اور اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں شرطیں دو طرح کی ہیں۔ بعض شرطیں وہ ہیں جو مرد و خواتین دونوں کے لئے یکساں ہیں، جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔ اب ذیل میں ان شرطوں کو بیان کیا جا رہا ہے جو خواتین کے ساتھ خاص ہیں۔

1. عدت میں نہ ہونا:

وجوب حج کے لئے خواتین میں جن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ان میں پہلی شرط یہ ہے کہ وہ خاتون عدت میں نہ ہو۔ ایسی خواتین جو اپنے شوہر کی وفات، طلاق، یا فسخ نکاح کے بعد عدت گذار رہی ہوں، انھیں شریعت نے شوہر کے گھر میں عدت گذارنے کا حکم دیا ہے۔

2. محرم رشتہ دار یا شوہر کا ہونا:

وجوب حج کے لئے خواتین کے ساتھ یہ شرط بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی محرم رشتہ دار ہو یعنی کوئی ایسا رشتہ ہو جس کے ساتھ عورت کا نکاح کرنا درست نہ ہو، یا اس کے ساتھ شوہر ہو۔ حج کا ارادہ رکھنے والی خاتون کے ساتھ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی رشتہ دار ہو تو وہ ان کے ساتھ حج کی ادائیگی کے لئے جائے گی، بصورت دیگر اس پر حج کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی۔ اور جس کے ساتھ وہ حج کے لئے جائے گی اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانا بھی اسی خاتون کے ذمہ لازم ہوگا۔ اگر وہ مالی اعتبار سے اس کی استطاعت رکھتی ہو تو اس پر حج کی ادائیگی لازم ہوگی ورنہ نہیں۔ یہ شرط اس وقت ہے جب کہ خاتون مکہ مکرمہ سے مسافت سفر (78 کیلومیٹر) سے دور ہو، لیکن اگر وہ اس مسافت کے اندر ہو تو اس کے لئے یہ شرط نہیں ہے۔

4.6 حج کے ارکان ومناسک

4.6.1 حج کے ارکان:

حج کے ارکان دو ہیں: پہلا رکن وقوف عرفہ اور دوسرا رکن طواف زیارت

وقوف عرفہ کا مطلب عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے۔ وہاں قیام کا آغاز 9/ذی الحجہ کو زوال آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے اور یوم النحر یعنی دسویں ذی الحجہ کے صبح صادق کے طلوع ہونے کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وقوف عرفہ کے اس رکن کی ادائیگی کے لئے یہ کافی ہے کہ عرفات کے میدان میں چند لمحوں کے لئے بھی قیام کرلیا جائے۔ البتہ نویں ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک وہاں قیام کرنا واجب ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص غروب آفتاب سے پہلے میدان عرفات سے کوچ کر جائے تو رکن ادا ہو جانے کی وجہ سے اس کا حج تو درست ہو جائے گا، لیکن واجب چھوڑنے کی وجہ سے ایک 'دم' یعنی ایک جانور کی قربانی بطور کفارہ لازم ہوگی۔

دوسرا رکن طواف زیارت ہے۔ وقوف عرفہ کی ادائیگی کے بعد حاجی مزدلفہ جائے گا، وہاں رات قیام کرنے کے بعد صبح یوم النحر یعنی دسویں ذی الحجہ کو منیٰ چلا جائے گا، منیٰ میں رمی، قربانی اور حلق کرنے کے بعد مکہ مکرمہ آئے گا اور وہاں خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے گا۔ خانہ کعبہ کے گرد اسی چکر لگانے کو طواف زیارت، طواف افاضہ اور طواف رکن وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ حج میں رکن ہے، اس لئے اس کی ادائیگی کے بغیر حج کی فرضیت ادا نہیں ہوگی۔

4.6.2 حج کے واجبات:

حج کے واجبات پانچ ہیں: سعی، وقوف مزدلفہ، رمی جمار، حلق وقصر، طواف صدر

حج کے واجبات میں سعی پہلا واجب ہے۔ عربی زبان میں 'سعی' کے معنی دوڑنے اور کوشش کرنے کے ہیں۔ حج کے دوران خانہ کعبہ کی طواف زیارت کے بعد یہ واجب ادا کی جاتی ہے۔ اس میں طواف زیارت سے فراغت کے بعد صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات چکر دوڑ لگایا جاتا ہے، اس لئے 'سعی' کہا جاتا ہے، اس کا آغاز صفا سے اور اختتام مروہ پر ہوتا ہے۔ دوسرا واجب مزدلفہ میں قیام کرنا ہے۔ عرفات میں قیام کے بعد جب آفتاب غروب ہو جائے تو وہاں سے حاجی مزدلفہ کے لئے کوچ کرے گا، اور وہاں پوری رات مقیم رہے گا۔ جب فجر طلوع ہو جائے تو وہاں سے منیٰ کو روانہ ہو جائے گا، اور وہاں دیگر احکام پر عمل کرے گا۔ البتہ مزدلفہ سے طلوع فجر سے پہلے کوچ کرنا درست نہیں ہے، طلوع فجر سے پہلے کوچ کرنے سے وقوف مزدلفہ کی ادائیگی نہیں ہوگی اور اس پر ایک جانور بطور فدیہ قربان کرنا ضروری ہوگا۔

حج میں تیسرا واجب 'رمی جمرات' ہے۔ منیٰ میں تین ستون ہیں جن پر کنکریاں ماری جاتی ہیں، اسی عمل کو 'رمی جمرات' کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل اس سنت ابراہیمی کی یادگار ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کی خاطر قربان کرنے منیٰ لے جاتے ہوئے ادا کیا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو منیٰ لے جا رہے تھے تو راستہ میں شیطان حائل ہوا، جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سات کنکریوں ماری تھیں۔ چنانچہ حج کے دوران شیطان پر کنکریاں مارنے کے ذریعہ اسی سنت کو رمی جمرات کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔

دسویں ذی الحجہ یعنی یوم النحر کے طلوع فجر سے اس سنت کی ادائیگی کا آغاز ہوتا ہے۔اس دن صرف جمرۃ عقبہ یعنی سب سے بڑے ستون یعنی شیطان پر سات کنکریاں ماری جاتی ہیں۔اس دن کے رمی جمرات کا وقت دوسرے دن یعنی گیارہویں تاریخ کے طلوع فجر سے پہلے پہلے تک باقی رہتا ہے۔البتہ اس دن کا مسنون اور افضل وقت دسویں ذی الحجہ کے زوال آفتاب تک ہے۔دسویں تاریخ کے بعد کے تین دنوں میں بھی رمی کی جائے گی،ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ان دنوں میں سے پہلے دو دن یعنی گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو رمی کا وقت طلوع فجر کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے اور دوسرے دن کے طلوع فجر سے پہلے پہلے تک باقی رہتا ہے۔لیکن ان دونوں دنوں میں افضل اور مستحب وقت زوال آفتاب کے بعد شروع ہو کر غروب آفتاب تک باقی رہتا ہے۔ان دنوں میں تینوں ستونوں پر کنکریاں ماری جائیں گی، پہلے جمرہ اولیٰ پر کنکریاں ماری جائیں گی، جو مسجد خیف کے قریب واقع ہے،اس کے بعد جمرہ وسطیٰ پر اور پھر آخر میں جمرہ عقبہ پر جو مکہ مکرمہ کی جانب ہے کنکریاں ماری جائیں گی۔ایام تشریق میں سے تیسرے دن یعنی تیرہویں ذی الحجہ کو رمی کرنا واجب نہیں ہے،لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب حاجی تیرہویں ذی الحجہ کی رمی کا وقت شروع ہونے سے پہلے منیٰ سے کوچ کر جائے۔لیکن اگر کوئی حاجی اس دن کی رمی کا وقت شروع ہونے تک منیٰ میں مقیم رہے تو اس پر اس دن کی رمی کرنی واجب ہوگی۔اس دن کی رمی کا وقت طلوع فجر سے شروع ہو کر غروب آفتاب تک باقی رہتا ہے۔

حج کا چوتھا واجب حلق وقصر ہے۔حج میں اس واجب کا مطلب یہ ہے کہ جب حاجی وقوف عرفہ کے بعد منیٰ میں رمی جمرات اور قربانی سے فارغ ہو جائے تو اپنے بال منڈوالے یا چھوٹے کرالے۔اس واجب کی ادائیگی کے ساتھ ہی حاجی کے لئے شوہر و بیوی کے آپسی تعلقات کے علاوہ وہ تمام چیزیں حلال ہو جائیں گی جو اس کے احرام باندھنے کے بعد حرام ہوگئی تھیں۔

حج میں پانچواں واجب طواف وداع کی ادائیگی ہے۔حج کے واجبات میں یہ آخری واجب ہے۔یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے گھر خانہ کعبہ سے رخصت ہونے کے بطور الوداعی طواف اور زیارت ہے۔اس کے صحیح ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ حاجی نے حج کے ارکان یعنی وقوف اور طواف زیارت کی ادائیگی کر لی ہو،اس کے بعد طواف وداع کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔البتہ افضل اور مستحب طریقہ یہ ہے کہ حج کے تمام ارکان ومناسک کی ادائیگی کے بعد جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو حاجی اپنے آخری عمل کے طور پر اس کی ادائیگی کرے۔خواتین کو اس واجب کی ادائیگی میں یہ رخصت حاصل ہے کہ اگر وہ ان مخصوص ایام میں ہوں جن میں وہ پاک نہیں ہوتیں تو وہ اس واجب کو چھوڑ دیں اور اس پر انھیں دم دینا بھی واجب نہیں ہوگا۔

4.6.3 حج صحیح ہونے کی شرطیں:

حج کے صحیح ہونے کی پہلی شرط 'احرام باندھنا' ہے۔عربی زبان میں 'احرام' کے معنی 'حرام کرنا' ہے۔چونکہ حاجی جب حج کی نیت سے حج کے مخصوص لباس یعنی ایک بغیر سلی ہوئی لنگی اور چادر پہنتا ہے تو وہ اپنے اوپر بہت سی ایسی چیزوں کو حرام کر لیتا ہے جو عام حالات میں اس کے لئے جائز اور حلال ہوتی ہیں۔اس لئے اس عمل کو احرام باندھنا،اور احرام باندھنے والے کو 'مُحرِم' کہا جاتا ہے۔اس عمل کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ حاجی لنگی اور چادر پہننے کے ساتھ ہی حج کی نیت بھی کر لے اور تلبیہ پڑھے یا عملی طور پر قربانی کا جانور اپنے ساتھ لے لے۔احرام باندھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے حاجی اپنے بال کٹوالے،ناخن اور مونچھ تراش لے،بغل اور دیگر بال صاف کر لے اور پھر وضو یا غسل کر لے، زیادہ بہتر یہ ہے کہ غسل کر لے اس کے بعد حج کی نیت سے احرام باندھ لے۔احرام میں پہلے ایک بغیر سلا ہوا کپڑا لے اور اسے لنگی کی طرح کمر سے اس طرح باندھے کہ وہ اس کے نیچے کے حصہ کا لباس بن جائے۔اسے 'ازار' کا نام دیا جاتا ہے۔دوسرا بغیر سلا ہوا کپڑا اپنے بائیں مونڈھے

کے اوپر سے اس طرح لپیٹے کہ داہنے بغل کے نیچے سے کپڑا گھوم جائے اور داہنا مونڈھا کھلا رہ جائے۔ اسے 'چادر' یا 'اضطباع' کا نام دیا جاتا ہے۔

حج کے صحیح ہونے کے لئے دوسری شرط حج کا وقت ہونا ہے۔ شریعت نے حج کے اوقات مقرر کر دیئے ہیں۔ حج کی ادائیگی انھیں اوقات میں کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی شخص ان کے علاوہ اوقات میں حج ادا کرتا ہے تو شریعت کی نظر میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ''۔ (بقرہ:197) یعنی حج کے چند متعین مہینے ہیں۔

قرآن کریم کی اس آیت کی بنیاد پر فقہاء نے حج کے اوقات متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس آیت میں جن مہینوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سبھی فقہاء کی رائیں متفق ہیں، لیکن آخری ایام کی تعیین میں ان کے درمیان مختلف رائیں ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے کے مطابق شوال اور ذوقعدہ دو پورے مہینے اور ذوالحجہ کے شروع کے دس دن اس میں شامل ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک 'اشہر معلومات' سے مراد شوال اور ذوقعدہ دو مہینے اور ذوالحجہ کے ابتدائی نو دن ہیں۔ امام مالکؒ نے شوال، ذوقعدہ اور ذی الحجہ تینوں مہینوں کو 'اشہر معلومات' قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان متعین مہینوں اور دنوں کے پہلے یا بعد میں حج کی ادائیگی صحیح نہیں ہوگی۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر کوئی شخص حج کے اِن ایام کے شروع ہونے سے پہلے احرام باندھ لے تو کراہت کے ساتھ درست ہو جائے گا۔

4.7 حج کے ممنوعات

اوپر گذر چکا ہے کہ احرام باندھ لینے کے بعد حاجی پر بہت سی ایسی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو عام حالات میں اس کے لئے جائز اور حلال تھیں۔ حج کے ممنوعات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن کا کرنا احرام باندھنے کے بعد حرام ہو جاتا ہے۔ احرام باندھنے کے بعد ایک حاجی کے لئے جن چیزوں کی ممانعت آئی ہے، ان میں سب سے پہلی چیز اس کا لباس ہے۔ حاجی جب احرام باندھتا ہے تو اسے دو مخصوص لباس پہننے کا حکم دیا گیا ہے، اور سلے ہوئے کپڑے پہننے سے منع کیا گیا ہے، ساتھ ہی ایسے کپڑوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے جن کی بُنائی اس کے جسم کی ساخت کے مطابق کی گئی ہو، اس کے علاوہ سر ڈھانکنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ البتہ خاتون کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ سلا ہوا اور ساتر کپڑا پہن سکتی ہے، لیکن اس کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ اپنے چہرہ کھلا رکھے۔ لیکن اگر حاجی کسی ایسی چیز سے اپنا سر ڈھانکے یا حاجیہ اپنا چہرہ چھپائے جو اس کے سر یا چہرہ سے سٹا ہوا نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

احرام باندھ لینے کے بعد اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ حاجی نہ اپنے جسم کے کسی بھی حصہ کے بال کاٹے، نہ ناخن تراشے، نہ ہی تیل لگائے اور نہ خوشبو کا استعمال کرے۔ حاجی کے لئے یہ اعمال نہ خود اپنے جسم کے ساتھ کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ۔

احرام کی حالت میں ایسے جانوروں کے شکار کرنے اور جال میں پھنسانے سے منع کیا گیا ہے جو خشکی والے جانور ہیں۔ یعنی ایسے جانور جن کے پیر یا پَر ہیں اور وہ خود کو بھاگ کر یا اڑ کر بچا سکتے ہیں، ان کا شکار کرنا حرام ہے۔ حالت احرام میں شکار کرنے سے مراد یہ ہے: جانور کو قتل و ذبح کرنا، قید کرنا، جال میں پھنسانا، تکلیف دینا، شکار کرنے میں کسی بھی طرح کا تعاون کرنا خواہ شکار کی جانب اشارہ کر کے یا ہتھیار فراہم کر کے، یا حکم دے کر، یہ تمام اعمال شکار کرنے میں شامل ہیں، اور حج کے ایام میں یہ سب حرام ہیں۔ البتہ سمندری جانوروں کے شکار کی

اجازت دی گئی ہے۔

اسی طرح حرم کے اندر کے درخت کو کاٹنے ،توڑنے اور اکھاڑنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔گھاس سے متعلق بھی وہی حکم ہے جو درخت کا ہے۔البتہ ایسے درخت اور اس کی ڈالیا جو سوکھ گئی ہوں اور ٹوٹ کر گر گئی ہوں، وہ اس حکم سے باہر ہیں۔

حاجی کے لئے احرام باندھ لینے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔اسی طرح ایسے تمام جنسی مزاح اور اعمال جو شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے ہوں ممنوع ہیں۔

4.8 حج کی قسمیں

حج اور عمرہ کی ادائیگی اور احرام ونیت کے اعتبار سے حج کی تین قسمیں ہیں:

حج کی پہلی قسم ''افراد'' ہے۔اس میں حاجی صرف حج کی نیت سے احرام باندھتا ہے اور اس کے تمام ارکان ومناسک ادا کرتا ہے۔

حج کی دوسری قسم ''قران'' کہلاتا ہے۔لغت میں قران دو چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنے کو کہا جاتا ہے۔چونکہ حج کی اس قسم میں حاجی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھتا ہے،اس لئے اسے قران کہا جاتا ہے۔حج کے اس طریقہ کے صحیح ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ حاجی پہلے عمرہ کی نیت سے حج کے ایام میں احرام باندھے،اس کے بعد حج کا احرام باندھے۔دوسری شرط یہ ہے کہ عمرہ کے مکمل طواف یا کم از کم اس کا اکثر حصہ یعنی چار چکر ایام حج میں مکمل ہوئے ہوں۔تیسری شرط یہ ہے کہ حج کے وقوف عرفہ سے پہلے عمرہ کا طواف زیارت مکمل یا اس کا اکثر حصہ ادا کر چکا ہو۔چوتھی شرط یہ ہے کہ قران کرنے والا مسجد حرام کے گرد ونواح میں رہنے والا نہ ہو۔

حج کی تیسری قسم ''تمتع'' ہے۔تمتع کے معنی لغت میں فائدہ اٹھانے کے ہیں۔حاجی اس حج میں حج کے ایام میں پہلے عمرہ کی نیت سے احرام باندھتا ہے اور عمرہ سے فارغ ہو کر حلال ہو جاتا ہے،اور احرام کے بہت سے ممنوعات سے اس دوران فائدہ اٹھاتا ہے اس لئے اسے حج تمتع کہا جاتا ہے۔عمرہ کی ادائیگی کے بعد حاجی اسی سال دوبارہ حج کی نیت سے احرام باندھتا ہے اور اس کے ارکان ومناسک کی ادائیگی الگ سے کرتا ہے۔حج تمتع کے صحیح کے لئے یہ شرط ہے کہ حاجی حج سے پہلے عمرہ کی مکمل ادائیگی یا کم از کم دوسرے رکن یعنی طواف زیارت کا اکثر حصہ ادا کر چکا ہو۔دوسری شرط یہ ہے کہ حاجی نے عمرہ ایام حج میں ادا کیا ہو۔اگر عمرہ کی ادائیگی ایام حج سے پہلے کی جا چکی ہو تو وہ حج تمتع نہیں ہوگا۔تیسری شرط یہ ہے کہ حج وعمرہ ایک ہی سال ادا کئے جائیں۔اگر کوئی شخص عمرہ ایک سال ادا کرتا ہے اور حج دوسرے سال،تو یہ حج تمتع نہیں ہوگا، اگر چہ وہ پورے سال احرام باندھے رہے۔چوتھی شرط یہ ہے کہ حج وعمرہ ایک ہی سفر میں ادا کئے جائیں،اور ان کے درمیان کوئی سفر واقع نہ ہوا ہو۔پانچوی شرط یہ ہے کہ حاجی حج کے احرام باندھنے سے پہلے عمرہ سے فارغ ہو کر اس کا احرام کھول چکا ہو۔ایک اور شرط یہ ہے کہ تمتع ادا کرنے والا شخص مسجد حرام کے نواح کا باشندہ نہ ہو۔

4.9 حج کے میقات

احرام باندھنا حج کے صحیح ہونے کے لئے پہلی شرط ہے،اور اسی کے ذریعہ حج کا آغاز ہوتا ہے۔احرام باندھنے کے لئے جن مقامات کی تعیین کی گئی ہے انھیں کو میقات کہا جاتا ہے۔حج وعمرہ کے لئے دنیا کے مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلی قسم کے وہ لوگ ہیں جو مکہ مکرمہ اور حرم میں رہتے ہیں، دوسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جو مکہ مکرمہ اور متعینہ مواقیت کے درمیان رہتے ہیں، اور تیسرے قسم مواقیت سے باہر رہنے والوں کی ہے۔پہلی دو قسموں کے افراد کی میقات ان کے گھر اور وہ جگہ ہیں جہاں انہوں نے سکونت اختیار کی

ہوئی ہے۔اوران کے علاوہ تیسری قسم کے لوگوں کے احرام باندھنے کے لئے جن مقامات کو متعین کیا گیا ہے ان کی تعداد پانچ ہے:

ذوالحلیفہ: یہ مدینہ منورہ والوں کے لئے میقات ہے۔اسے اب ''بئر علی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جحفہ: یہ اہل شام، مصر اور مغربی ممالک کی میقات ہے۔سمندر سے آنے والے لوگ جب اس کے بالمقابل سمندر میں پہنچتے ہیں تو وہاں احرام باندھ لیتے ہیں۔

قرن المنازل: اسے آج کل ''سیل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ ہے، اور مکہ مکرمہ کے سب سے قریبی میقات یہی ہے۔یہ نجد والوں کی میقات ہے۔

یلملم: یہ میقات یمن، تہامہ اور ہندوستان والوں کے احرام باندھنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

ذات عرق: یہ اہل عراق اور مشرق سے آنے والے لوگوں کی میقات ہے۔

جب کوئی شخص ان متعینہ مواقیت سے گذرے تو واجب ہے کہ احرام باندھ لے۔ان سے بغیر احرام گذرنا حرام ہے، اور اگر کوئی شخص گذر جائے تو اس کمی کی تلافی کے لئے قربانی دینا ضروری ہوگا۔

جن مقامات کو بطور میقات مقرر کیا گیا ہے ان میں جو میقات مکہ مکرمہ سے سب سے زیادہ دور ہے وہاں سے احرام باندھنا افضل ہے، تاکہ کسی بھی میقات سے بغیر احرام حاجی نہ گذرے۔

اگر کوئی شخص ان مواقیت سے پہلے حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے تو یہ بلا کراہت درست ہے۔اوپر جن مقامات کی تعیین مواقیت کے طور پر کی گئی ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ بغیر احرام کوئی شخص ان مقامات سے آگے نہ بڑھ جائے۔

4.10 حج بدل کے احکام

حج بدل کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کی جانب سے حج ادا کرنا۔حج کی یہ صورت چند شرطوں کے ساتھ درست ہے:

اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوا ہے اس میں سفر حج کی طاقت نہ ہو۔طاقت نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسے موت آ جائے تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ اپنی موت سے پہلے کسی کو اپنے نائب کے طور پر وصیت کرے کہ وہ اس کی جانب سے حج ادا کر دے۔یا وہ قید میں ہو یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ جس سے شفاء کی امید نہ ہو مثلاً اندھا پن، فالج، لنگڑا پن، ہاتھ پاؤں سے معذور شخص۔یا وہ بڑھاپے کے اس مرحلہ میں قدم رکھ چکا ہو کہ اسے خود سے سواری پر سوار ہونے کی بھی طاقت نہ ہو۔اسی طرح ایسی خاتون بھی اپنی جانب سے حج بدل کرا سکتی ہے جس کا نہ شوہر ہو اور نہ ہی کوئی محرم رشتہ۔تو ایسے افراد کی جانب سے حج بدل کی ادائیگی درست ہوگی۔

اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ حج بدل ادا کرانے والا شخص اگر اپنی زندگی میں کبھی موجودہ بیماری سے شفاء یاب ہو جائے تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ دوبارہ حج کرے۔کیونکہ حج بدل کی اجازت جس وجہ سے دی گئی تھی اب وہ وجہ ختم ہو چکی ہے، لہٰذا اس شخص پر دوبارہ حج بطور خود ادا کرنا لازم ہوگا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوا ہے اور وہ زندہ ہے تو اس نے خود حج بدل کا حکم دیا ہو۔لہٰذا اگر کوئی شخص اس کی زندگی میں اس کی اجازت کے بغیر حج بدل ادا کر لے تو اس شخص سے اس کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی۔البتہ اگر اس شخص کی وفات ہو جائے اور اس کے ورثاء میں سے کوئی اس کی جانب سے حج بدل ادا کر دے تو یہ اس کی اجازت اور حکم کے بغیر بھی درست ہو جائے گا۔

چوتھی شرط حج بدل میں نیت کرتے وقت اس شخص کی جانب سے ادائیگی کی نیت کی جائے جو حج کرار ہا ہے، اور افضل یہ ہے کہ تلبیہ کہتے وقت اس شخص کا نام لے لیا جائے، اس طرح سے: ''**لبیک عن فلان**''۔ اگر حج بدل کرنے والے شخص نے نیت کے وقت خود کی جانب سے یا کسی اور کی جانب سے ادائیگی کی نیت کر لی تو حج بدل کا حکم دینے والے شخص کی طرف سے حج ادا نہیں ہوگا۔

پانچوی شرط یہ ہے کہ حج بدل کا خرچ وہ شخص برداشت کرے جس پر حج فرض ہوا ہے نہ کہ نیابت کرنے والا شخص اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص۔ اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نائب شخص حج میں آنے جانے کے لئے سواری کا استعمال کرے، اور اس کا خرچ حج کرانے والا شخص اٹھائے۔

ایک اور شرط یہ ہے کہ حج بدل کے لئے کوئی اجرت (معاوضہ) مقرر نہ کی جائے۔ اگر اخراجات میں رقم کی کمی ہو تو حج کرانے والے شخص سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اس کمی کو پورا کرے، اسی طرح اگر حج کے اخراجات کے بعد رقم بچ جائے تو وہ حج کرانے والے شخص کو واپس کر دی جائے گی۔

حج بدل کے دوران وقوف عرفہ سے پہلے اگر حج کرنے والے سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوا جس سے حج فاسد ہو گیا تو پوری رقم حج بدل کرانے والے کو واپس کی جائے گی، لیکن اگر وقوف عرفہ کے بعد کوئی ایسا عمل سرزد ہوا تو حاجی پر رقم واپسی کی ذمہ داری نہ ہوگی۔ البتہ اس کی وجہ سے حج میں جو دم (فدیہ/کفارہ) ادا کئے جائیں گے وہ حاجی خود اپنی جانب سے کرے گا، نہ کہ حج بدل کرانے والے کی جانب سے ہوگا۔

4.11 حج کے فوائد اور مصالح

اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے جو طریقے بتائے ہیں ان میں حج ایک عظیم عبادت ہے۔ اس کے فوائد و مصالح بے شمار ہیں۔ جس کے اثرات انسان کی خود اپنی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، اس کے بعد اس کے باہر گھر خاندان، معاشرہ اور اس سے بھی بڑھ کر عالمی سطح پر اس کے اثرات پھیلتے ہیں۔ ذیل میں ان فوائد و مصالح کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

- ✯ حج کے ذریعہ اللہ عزوجل کی عظمت اور اس کی وحدانیت کا اقرار ہوتا ہے۔ حاجی جب حج کی نیت کرتا ہے اور احرام باندھتا ہے، تو شریعت کے حکم کے مطابق امیر سے امیر ترین شخص بھی اپنے پسندیدہ لباس و پوشاک، دوست احباب، گھر کی راحت و آرام اور خدام وغیرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیت اللہ کی زیارت کے لئے نکل پڑتا ہے، اور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ''**لبیک اللھم لبیک، لا شریک لک**''، یعنی اے اللہ! میں حاضر ہوں اور تیرا کوئی شریک نہیں۔ گویا وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ دنیا کی یہ سارے آرام و آسائش کی اللہ رب العالمین کے حکم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اللہ کے حضور سر تسلیم خم اور اپنی تذلل و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔
- ✯ حاجی جب احرام باندھتا ہے تو اس پر بہت سی ایسی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو عام حالات میں اس کے لئے حلال تھیں۔ اس کے ذریعہ لوگوں کو اس دنیا کی عیش و عشرت اور آرام پسند زندگی سے باہر نکلنے اور سادگی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تاکہ حرم مکی میں امیر اور غریب سبھی طرح کے لوگ ایک صف میں آ جائیں اور ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہ جائے۔ اس کے ذریعہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انھیں اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے کہ جس طرح یہاں حرم مکی میں اپنے دنیاوی راحت و آرام کو چھوڑ کر آئے ہیں، اور امیر و غریب ایک ساتھ ایک جگہ جمع ہیں اسی طرح قیامت کے دن سب ایک جیسے ایک جگہ جمع ہوں گے، اور وہاں کوئی کسی کا مددگار نہ ہوگا، اور اس دنیا کی چند روزہ نعمتیں فنا ہو چکی ہوں گی۔ لہٰذا اگر انھوں نے آخرت کی تیاری نہیں کی تو وہاں کی ذلت و رسوائی

ان کا مقدر بنیں گی۔

- ✯ حاجی جب احرام باندھتا ہے تو پورے حج کے دوران محض دو کپڑوں میں وہ ملبوس ہوتا ہے۔ جس سے اس کے اندر اپنے محاسبہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اس کا دل سخاوت اور فیاضی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ نہ صرف مستحقین کے حقوق اور ان کی ذمہ داریاں ادا کرنے پر اکتفاء کرتا ہے بلکہ دوسرے رشتہ داروں، ضرورت مندوں، پڑوسیوں اور دیگر دوست و متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ کے امیر و غریب کا فرق کم ہوتا ہے، ان کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ استوار ہوتا ہے۔
- ✯ حج کے ذریعہ اجتماعت اور یکسانیت کا پیغام لوگوں میں عام ہوتا ہے۔ اس میں دنیا کے مختلف علاقوں سے امیر، غریب، کالے، گورے، عالم، جاہل، خوبصورت، بدصورت، مختلف علاقوں اور مختلف تہذیبوں کے حاملین، مختلف زبانوں کے بولنے والے ہر طرح کے لوگ اس ندائے الٰہی پر لبیک کہتے ہوئے خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے حاضر ہو جائے ہیں۔ اس سے جہاں مسلمانوں کی اجتماعت کی عکاسی ہوتی ہے، وہیں اس سے خدائے واحد کے ایک بلاوے پر اس کے حضور اپنا سر تسلیم خم کر دینے کے مسلمانوں کے جذبات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔
- ✯ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان کی شکر گذاری بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جسمانی نعمتوں کا شکرانہ نماز کے طور پر انسان ادا کرتا ہے، مالی نعمتوں کا شکرانہ زکوٰۃ ہے اور ان دونوں طرح کی نعمتوں کا مجموعی شکرانہ حج ہے۔

4.12 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں ہم نے درج ذیل نکات کا مطالعہ کیا:

- ✯ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔
- ✯ حج کے لغوی معنی ارادہ اور قصد کرنے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں ایام حج میں احرام باندھ کر بعض مخصوص مقامات کی زیارت کرتے ہوئے شریعت کے دیئے گئے احکام پر عمل کرنے کو حج کہتے ہیں۔
- ✯ حج فرض ہونے کے لئے کئی شرطیں ہیں، جن میں مسلمان ہونا، بالغ ہونا، آزاد ہونا، استطاعت ہونا، خواتین کا عدت میں نہ ہونا اور ان کے ساتھ شوہر یا کسی محرم رشتہ دار کا ہونا شامل ہیں۔
- ✯ استطاعت کے ضمن میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مالی اعتبار سے اس قابل ہو کہ حج میں آنے جانے کا خرچ برداشت کر سکے، سواری کا انتظام کر سکے اور اپنے پیچھے رہ جانے والے متعلقین جن کی حقوق اس پر ہیں ان کی ادائیگی کر سکے۔
- ✯ استطاعت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے صحت مند ہو اور راستہ مامون ہو۔
- ✯ حج کے ارکان دو ہیں، پہلا وقوف عرفہ اور دوسرا طواف زیارت
- ✯ حج کے واجبات پانچ ہیں: سعی، وقوف مزدلفہ، رمی جمار، حلق و قصر، طواف صدر
- ✯ حج صحیح ہونے کی شرطوں میں احرام باندھنا اور ایام حج کا پایا جانا داخل ہیں۔
- ✯ ممنوعات حج میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ مردو کے لئے سلے ہوئے کپڑے پہننا، سر چھپانا، عورتوں کے لئے چہرہ چھپانا، بال کاٹنا، ناخن تراشنا، تیل لگانا، خوسبو کا استعمال کرنا، شکار کرنا، درخت کاٹنا، شوہر بیوی کے تعلقات قائم کرنا۔ یہ سبھی اعمال حج کے دوران ممنوع

ہیں۔

- ✯ حج کی تین قسمیں ہیں: افراد، قران، تمتع
- ✯ حج کے لئے احرام باندھنے کے پانچ میقات مقرر ہیں: ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل، یلملم، ذات عرق
- ✯ اگر کوئی شخص ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس سے شفایابی کی امید نہیں ہے یا ایسا بوڑھا شخص جو خود سواری پر سوار ہونے طاقت نہیں رکھتا ہے تو اپنے جانب سے اپنے خرچ پر کسی دوسرے سے حج بدل کرا سکتا ہے۔

4.13 نمونہ امتحانی سوالات

4.13.1 معروضی سوالات:

1. لغت میں 'حج' کے کیا معنی نہیں ہے؟

(أ). ارادہ کرنا (ب). رک جانا (ج). دعا کرنا (د). پاک کرنا

2. ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً'' اس آیت سے کس کی فرضیت ثابت ہوتی ہے؟

(أ). نماز (ب). روزہ (ج). حج (د). زکوٰۃ

3. استطاعت کے ضمن چیزیں شامل ہیں؟

(أ). راستہ میں جنگ نہ ہونا (ب). اپاہج نہ ہونا (ج). حج کا خرچ (د). سب صحیح

4. دیل ذیل میں سے کون واجبات حج میں سے نہیں ہے؟

(أ). وقوف عرفہ (ب). وقوف مزدلفہ (ج). رمی جمار (د). سعی

5. یوم النحر کو کس 'جمرۃ' پر کنکریاں ماری جائیں گی؟

(أ). جمرۃ وسطیٰ (ب). جمرۃ اولیٰ (ج). جمرۃ عقبہ (د). تمام جمرات پر

6. درج ذیل میں سے کون حج کے ممنوعات میں سے ہے؟

(أ). ناخن تراشنا (ب). بال کاٹنا (ج). سر ڈھانکنا (د). سب صحیح

7. حج کی کتنی قسمیں ہیں؟

(أ). دو (ب). تین (ج). پانچ (د). سب غلط

8. حج کی کس قسم میں حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھا جاتا ہے؟

(أ). قران (ب). تمتع (ج). افراد (د). حج بدل

9. درج ذیل میں سے کون میقاتِ حج نہیں ہے؟

(أ). ذوالحلیفہ (ب). یلملم (ج). فسطاط (د). جحفہ

10. شرعی نقطہ نظر سے حج بدل کون کرا سکتا ہے؟

(أ). اندھا شخص (ب). بہت بوڑھا شخص (ج). فالج زدہ شخص (د). سب صحیح

4.13.2 مختصر جوابی سوالات:

1. حج کے معنی ومفہوم کو بیان کرتے ہوئے اس کی فرضیت پر روشنی ڈالئے۔
2. حج کے ممنوعات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
3. حج کی قسموں کا جائزہ لیجئے؟
4. حج بدل کے احکام بیان کیجیے۔
5. حج کے فوائد ومصالح پر گفتگو کیجئے۔

4.13.3 طویل جوابی سوالات:

1. حج کے اہمیت وفضیلت پر ایک مفصل نوٹ تحریر کیجیے۔
2. وجوب حج کی شرطوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. حج کے ارکان ومناسک پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

4.14 تجویز کردہ کتابیں

1. قاموس الفقہ (جلد سوم) : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
2. اسلامی فقہ : مولانا مجیب اللہ ندوی
3. اسلامی فقہ : مولانا منہاج الدین مینائی
4. ارکان اربعہ : مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
5. موسوعہ فقہیہ کویتیہ (جلد 17، اردو) : اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا

-:oOo:-

اکائی 5 : قرآن مجید-تعارف اور جمع وتدوین

اکائی کے اجزاء

5.1 مقصد

5.2 تمہید

5.3 تعریف

5.4 قرآن مجید کا موضوع

5.5 سورتیں اور آیتیں

5.6 پہلی اور آخری آیت

5.7 جمع قرآن عہد نبوی میں

5.7.1 جمع قرآن بصورت حفظ

5.7.2 جمع قرآن بصورت کتابت

5.8 جمع قرآن عہد صدیقی میں

5.9 جمع قرآن عہد عثمانی میں

5.10 تسہیل تلاوت کی کوششیں

5.10.1 قرآن مجید پر نقطے

5.10.2 قرآن مجید پر اعراب

5.10.3 منزلیں، پارے اور رکوع

5.10.4 رموز اوقاف

5.11 قرآن مجید پریس پر

5.12 قرآن مجید سے متعلق ضروری اعداد وشمار

5.13 مکی ومدنی سورتیں

5.13.1 مکی سورتوں کی خصوصیات

5.13.2 مدنی سورتوں کی خصوصیات

5.14 خلاصہ

5.15 نمونۂ امتحانی سوالات

5.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

5.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ کے سامنے بہت تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کا تعارف اور اس کی تدوین وجمع کے طریقے آجائیں گے۔اس کو پڑھ کر طلبہ واقف ہو جائیں گے کہ قرآن کو خود حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں کس طرح جمع اور محفوظ کیا گیا، پھر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی کے زمانوں میں اس کے محفوظ اور عام کرنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے گئے۔طلبہ اس بات سے بھی آگاہ ہوسکیں گے کہ قرآن کب کب اور کس طرح نازل ہوا۔اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوگا کہ قرآن میں کیا باتیں بتائی گئی ہیں اور اس کا موضوع کیا ہے؟

5.2 تمہید

اس اکائی میں قرآن مجید کا بھرپور اور مکمل تعارف کرایا جائے گا، پہلے قرآن کے لفظی معنی اور اس کی تعریف ذکر کرتے ہوئے قرآن کے موضوع سے واقف کرایا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ اس میں کتنی سورتیں اور آیتیں ہیں اور اس کی پہلی اور آخری آیتیں کون سی ہیں؟ قرآن کے جمع وتدوین کے تینوں مراحل یعنی عہد نبوی، پھر عہد صدیقی اور آخر میں عثمانی کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی بتایا جائے گا کہ قرآن مجید کی تلاوت کو آسان بنانے کے لیے اس پر نقطے، اعراب اور مختلف حصوں میں اس کی تقسیم کس طرح اور کب انجام پائی۔اسی طرح قرآن کی مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے گی اور یہ بھی بتایا جائے گا کہ قرآن مجید پریس کے ذریعہ چھپنا کب شروع ہوا اور آج اس سے متعلق ضروری اعداد وشمار کیا ہیں؟

5.3 تعریف

لفظ ''قرآن'' عربی گرامر کی رو سے مصدر ہے، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں، پھر یہیں سے یہ لفظ پڑھنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا، کیوں کہ پڑھنے میں بھی الفاظ جمع ہو جاتے ہیں، عربی زبان میں کبھی کبھی مصدر کو اسم مفعول کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا اس لحاظ سے قرآن کے معنی ہو گئے ''پڑھی جانے والی کتاب''، لغت کی رو سے تو ہر کتاب کو قرآن کہا جاسکتا ہے، لیکن اصطلاح میں یہ لفظ صرف اس کتاب الٰہی کے لیے مخصوص ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے کم از کم اکسٹھ (61) مقامات پر اپنے کلام کا اسی نام سے ذکر فرمایا ہے۔

اس کتاب کو قرآن سے کیوں موسوم کیا گیا؟ اس کا سبب بھی اسی سے واضح ہو گیا، یعنی یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہوگی، اور واقعہ ہے کہ دنیا میں جس قدر اس کتاب کی تلاوت ہوتی ہے اور جتنی بڑی تعداد میں اس کی اشاعت عمل میں آتی ہے، دنیا کی کوئی مذہبی اور غیر مذہبی کتاب شاید اس کا ہزارواں حصہ بھی نہ پڑھی جاتی ہو، اس طرح اس کتاب کو قرآن کہہ کر گویا اللہ تعالیٰ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ یہ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہوگی اور آج اس پیشین گوئی کو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

قرآن کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :

''یہ اللہ تعالیٰ کا وہ معجز کلام (وہ کلام جس کی نظیر کوئی نہ پیش کر سکے) ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا ہوا ہے، آپ سے بغیر کسی شبہ کے بہ تواتر منقول ہے اور اس کی تلاوت عبادت ہے''۔

قرآن کے بعض اور نام بھی ہیں، جنھیں خود قرآن کریم نے اپنے لیے استعمال کیا ہے، وہ نام ہیں:1) فرقان (2) ذکر (3) کتاب (4) تنزیل۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کے مختلف صفاتی نام بھی ہیں، جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں۔

5.4 قرآن مجید کا موضوع

جس طرح حضرت محمد ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں، اسی طرح آپ ﷺ پر نازل ہونے والی یہ کتاب بھی آخری کتاب ہے، قرآن کے نزول کا اصل مقصد لوگوں کی ہدایت ورہنمائی ہے اور یہ کتاب تا قیامت لوگوں کو صحیح راہ بتلاتی رہے گی، اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے، چنانچہ دیگر آسمانی کتابوں کی طرح اس میں کسی تبدیلی وتحریف کا کوئی امکان نہیں، یہ کتاب کسی خاص قوم اور گروہ کی مذہبی کتاب نہیں؛ بلکہ اس کتاب میں پوری بنی نوع انسان کو مخاطب بنایا گیا ہے، خواہ وہ کسی قوم، کسی مذہب، کسی خطہ یا کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو، یہ ایک خدائی پیغام ہے جو ہر انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خالق اس سے کیا چاہتا ہے؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں کو ناپسند کرتا ہے؟ اس نے اس دنیا میں انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے مختلف سوالات ہیں جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا جواب اسے اسی کتابِ الٰہی سے مل سکتا ہے۔

5.5 سورتیں اور آیتیں

قرآن مجید ایک مسلسل مضمون نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سو چودہ حصوں میں بٹا ہوا ہے، جنھیں ایک کتاب کے ابواب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، ان ہی الگ الگ حصوں کو اللہ تعالیٰ نے ''سورہ'' کا نام عطا کیا ہے، ان سب سورتوں کے الگ الگ نام ہیں اور ہر سورہ کا ایک مستقل موضوع ہے، بعض سورتیں بہت لمبی ہیں اور بعض انتہائی مختصر، گویا ان کی مقدار میں بڑا فرق ہے، قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ ''سورۃ الکوثر'' تین آیات پر مشتمل ہے :

''إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ O فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ O إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ''۔ (کوثر:3-1)

جس طرح پورے قرآن میں کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں، اسی طرح ہر سورہ میں بھی چند آیات ہوتی ہیں، یہ آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ ہیں، سورتوں کی طرح ان کی مقدار میں بھی بڑا فرق ہے، بعض آیتیں نہایت مختصر اور دو تین الفاظ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً :

''كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ O فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ O فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ O مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ O بِأَيْدِي سَفَرَةٍ O كِرَامٍ بَرَرَةٍ''۔ (عبس:16-11)

بعض آیتیں بہت بڑی اور پندرہ بیس الفاظ کی ہیں، سب سے بڑی آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر:282 ہے، جس کو اس کے مضمون کے لحاظ سے آیت مداینت کہا جاتا ہے، موجودہ مصاحف میں ہر آیت کے اختتام پر ایک گول دائرہ بنا ہوتا ہے، جو اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ یہ آیت یہاں ختم ہوتی ہے اور آگے دوسری آیت شروع ہورہی ہے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر آیت ایک مکمل جملہ ہو، بلکہ

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی آیات کو ملا کر ایک جملہ مکمل ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایک ہی آیت کئی جملوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیتوں کی مقدار مقرر کرنے میں جملوں کی تکمیل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ قافیہ کے اہتمام کو اہمیت دی گئی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو اہل عرب مقفیٰ عبارتوں کے دلدادہ تھے اور دوسرے یہ چیز حفظِ قرآن میں معاون ثابت ہوتی ہے، بعد کے ادوار میں قرآن مجید میں سورتوں اور آیات کے علاوہ اور بھی تقسیمیں کی گئیں جن کا ذکر انشاءاللہ آئندہ آئے گا۔

5.6 پہلی اور آخری آیت

قرآن حضرت محمدؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا، گذشتہ مباحث میں وحی اور اس کی صورتوں پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے، حضرت محمدؐ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی، اس وقت آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی، ان دنوں آپ کو تنہائی میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ آپ غارِ حرا میں کئی کئی راتیں گزارتے اور عبادت میں مشغول رہتے، ایک دن اسی غار میں اللہ کی جانب سے ایک فرشتہ (حضرت جبرئیل) آیا اور آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی، یہ پہلی وحی سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی، یہ رمضان کا مہینہ تھا اور شمسی حساب سے ماہِ اگست 610ء کا زمانہ تھا، اس پہلی وحی کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، جسے فترتِ وحی کہا جاتا ہے، پھر وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور آخری وقت تک جاری رہا، سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیتیں سورہ توبہ کی آخری دو آیات ہیں:

''لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ O فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللهُ لاَ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ''۔(توبہ:129-128)

اس طرح سے قرآن ایک ہی بار میں پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ حالات اور ضرورت کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تئیس (23) سال کی مدت میں نازل ہوا۔

5.7 جمع قرآن عہد نبوی میں

جمعِ قرآن کی تاریخ جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن موجودہ ترتیب کے مطابق نازل نہیں ہوا، بلکہ یہ منتشر طور پر بغیر کسی ترتیب کے نازل ہوا، اس کی موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق حضرت محمد کے زیر نگرانی صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پائی۔

قرآن خدا کی آخری کتاب ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اسی لیے اس کی حفاظت کا کام بہت بڑے پیمانے پر انجام پایا ہے، عہد نبوی میں اس کی حفاظت دو پہلوؤں سے کی گئی :

(1) حفظ کے ذریعہ۔

(2) کتابت کے ذریعہ۔

5.7.1 جمع قرآن بصورت حفظ :

عہد نبوی میں جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا، اہل عرب پڑھنا لکھنا بہت کم جانتے تھے، اس وقت پڑھنے لکھنے کے وسائل یعنی کاغذ وغیرہ بھی آسانی سے میسر نہیں تھے اور لوگ کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے یاد کر لیتے تھے، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، یوں بھی اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، وہ طویل قصائد، مشہور جنگوں کے واقعات، نسب نامے حتیٰ کہ اپنے جانوروں تک کے پشتہا پشت کے نسب نامے زبانی یاد رکھتے تھے، چنانچہ قرآن نازل ہوا تو انھوں نے پورے ذوق وشوق

سے اسے یاد کرنا شروع کر دیا، صحابہ کرام کو قرآن سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بہت سارے صحابہ نے تو اپنی زندگی ہی قرآن سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کے لیے وقف کر دی تھی، وہ رات بھر جاگ کر نمازوں میں قرآن پڑھا کرتے، کثرتِ قراءت کی وجہ سے مسجد نبوی میں اتنا شور ہونے لگا کہ نبی کو یہ ہدایت دینی پڑی کہ پست آواز میں قرآن پڑھا جائے۔

اسی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ عہد نبوی میں ہی حفاظ صحابہ کی ایک بڑی تعداد وجود میں آ گئی تھی، روایات میں تقریباً چالیس صحابہ کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے پورا قرآن یاد کر لیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عہد نبوی میں کل صحابہ جنھیں پورا قرآن یاد تھا چالیس ہی تھے، بلکہ یہ تو وہ اصحاب ہیں جن کا نام روایات میں محفوظ رہ گیا ہے، ورنہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے نبی کریم کی حیات ہی میں قرآن مکمل حفظ کر لیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ بئر معونہ جو آنحضور کی زندگی میں پیش آیا، صرف اس ایک غزوہ میں ستر حفاظ صحابہ کے شہید ہونے کا ذکر ملتا ہے، اسی طرح آپ کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد ہونے والی جنگ یمامہ میں بھی اتنے ہی حفاظ شہید ہو گئے تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نبی کریم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد نے پورا قرآن حفظ کر لیا تھا، پھر ایسے صحابہ کا تو کوئی شمار نہیں جنھوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے، کیوں کہ نماز میں قراءت فرض ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ اسے قرآن سرے سے یاد ہی نہ ہو، پھر حفاظ کی یہ تعداد عہد بہ عہد بڑھتی ہی رہی اور اس طرح قرآن ایک بڑی تعداد کے ذریعہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

5.7.2 جمع قرآن بصورتِ کتابت :

جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ عہد نبوی میں کسی چیز کو محفوظ رکھنے کا اہم اور قابل اعتماد طریقہ حفظ کا تھا اور قرآن کو بھی اس طریقہ سے محفوظ کیا گیا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں نہ تو وسائل کتابت بہ آسانی میسر تھے اور نہ ہی لوگ بہت زیادہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ قرآن کی حفاظت کا خصوصی اور نہایت اعلیٰ اہتمام تھا کہ اسے حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعہ بھی محفوظ کیا گیا، نبی قرآن کی کتابت کا خاص اہتمام فرماتے تھے اور جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی، سب سے پہلے اسے لکھواتے، پھر پڑھوا کر سنتے اور اس کی اصلاح فرماتے تا کہ غلطی کا امکان نہ رہے اور تب جا کر اس کی عام اشاعت کا حکم دیا کرتے تھے۔

چوں کہ قرآن اپنی اصل ترتیب کے مطابق نازل نہیں ہوا، چنانچہ آپ نہ صرف آیات کو لکھوایا کرتے، بلکہ سورتوں کے اندر آیات کا مقام اور سورتوں کی ترتیب کی بھی نشاندہی فرماتے تھے، حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ حضور کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھا جائے، عرب میں اس زمانہ میں کاغذ کمیاب تھا، اس لیے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں اور جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی میسر آنے پر کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔

نبی کریم وحی کی کتابت کا اتنا اہتمام فرماتے تھے کہ اس کام کے لیے آپ نے بہت سے صحابہ کو مقرر فرمایا تھا، ان کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے، یعنی یہ چالیس صحابہ تھے جو نبی کریم کے لیے کتابتِ وحی کا فریضہ انجام دیتے تھے، ان میں سے چند مشہور صحابہ کے نام ہیں :حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت ابی بن کعب ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت ثابت بن قیس، حضرت معاویہ، حضرت ابان بن سعید، حضرت عبداللہ بن ابی سرح۔

اس طرح عہد نبوی ہی میں قرآن مجید پورا کا پورا لکھا ہوا موجود تھا اور نبی کریم نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کی ترتیب متعین فرمادی تھی، بہت سے صحابہ کرام کے پاس بھی قرآن کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، گرچہ وہ مختلف ٹکڑوں، ہڈیوں اور پارچوں پر لکھے ہوئے تھے اور کتابی شکل میں نہ تھے، خود حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے کہ ہم لوگ نبی کریم کے پاس بیٹھ کر قرآن کو کاغذ کے مختلف ٹکڑوں سے اکٹھا کیا کرتے تھے، اس کا اندازہ ان روایات سے بھی ہوتا ہے جن میں نبی کریم نے قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت بیان کی ہے اور دشمن کے علاقہ میں قرآن کے نسخے لے جانے سے منع فرمایا ہے تاکہ دشمن اس کی بے حرمتی نہ کریں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نبی کریم کی حیات ہی میں مکمل طور سے لکھا ہوا تھا اور مختلف صحابہ کے پاس بھی اس کے نسخے موجود تھے۔

5.8 جمع قرآن عہد صدیقی میں

نبی کریم کی حیاتِ مبارکہ میں قرآن لکھا تو جا چکا تھا مگر وہ مختلف ٹکڑوں، ہڈیوں، پتھروں اور کاغذوں پر لکھا ہوا تھا، اُمت کے پاس اس وقت تک کوئی ایسا نسخہ بھی موجود نہ تھا جو اُمت کی اجتماعی تصدیق سے تیار ہوا ہو اور بوقت ضرورت جس کی طرف رجوع کیا جا سکے، یہ تھیں وہ وجوہات جن کی بنا پر حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں جمع قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی، حضرت عمر نے خدشہ محسوس کیا کہ کہیں اس طرح کی مزید جنگوں میں حفاظ کی بڑی تعداد شہید نہ ہو جائے، چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ وہ اُمت کی اجتماعی تصدیق سے ایک نسخہ تیار کرائیں، حضرت ابوبکر نے بھی اس کی اہمیت کو محسوس کیا، لیکن اس اہم کام کے لیے کسی غیر معمولی صلاحیت کے حامل فرد کی ضرورت تھی، چنانچہ ان کی نظر انتخاب حضرت زید بن ثابت پر پڑی، کیوں کہ وہ نوجوان، سمجھدار، بااعتماد شخص تھے، حافظ قرآن بھی تھے اور رسول اللہ کے لیے وحی کی کتابت کا فریضہ بھی انجام دے چکے تھے، یہ کام اس قدر ذمہ داری کا متقاضی اور اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ ''خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا'' اس کام کے لئے حضرت عمر کو حضرت زید بن ثابت کا معاون بنایا گیا۔

اس مرحلہ میں جمع قرآن کی اہمیت اور اس سلسلے میں کیے جانے والے غیر معمولی اہتمام کا اندازہ اس طریق کار سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت زید بن ثابت نے اس موقع پر اختیار کیا، انھوں نے قرآن کا یہ نسخہ محض اپنے حفظ یا دیگر سینکڑوں حفاظ صحابہ کی یادداشت کی بنیاد پر تیار نہیں کیا، بلکہ اس کے لئے ایک نہایت مشکل اور پیچیدہ، لیکن انتہائی باوثوق اور محفوظ طریقہ کا انتخاب کیا، ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس وقت تک اپنے نسخے میں کوئی آیت درج نہیں کرتے تھے جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی دونوں شہادتیں نہ مل جائیں، پھر وہ لکھی ہوئی آیات تب ہی قبول فرماتے تھے، جب اس تحریر کے سلسلے میں دو لوگ گواہی دے دیتے کہ یہ آیات آنحضور کی نگرانی میں لکھی گئی تھیں، پھر ان طریقوں سے اکٹھا کی ہوئی آیات کا مقابلہ ان مجموعوں سے کیا جاتا تھا، جو مختلف صحابہ نے تیار کر رکھے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں تحقیق کے ان اعلیٰ اُصولوں کے تحت اُمت کی اجتماعی تصدیق سے قرآن کا ایک نسخہ وجود میں آیا، اگر ہم اس نسخے کی تیاری کے سلسلہ میں برتی جانے والی غیر معمولی احتیاط اور محفوظ طریق کار کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مقصد صرف قرآنی آیات کو ایک جگہ اکٹھا کرنا نہیں تھا، کیوں کہ اس طرح کے تو بے شمار نسخے صحابہ کرام کے پاس موجود تھے، بلکہ اس کا مقصد ایک ایسا نسخہ تیار کرنا تھا جو اُمت کی اجتماعی تصدیق کے ذریعہ تیار شدہ ہو اور جس کی موجودگی میں آگے چل کر کسی فتنہ و اختلاف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

عہد صدیقی میں مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق قرآن کا جو نسخہ تیار ہوا، وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا :

☆ قرآن کا یہ نسخہ نہایت اعلیٰ تحقیقی اُصولوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا اور اس میں اُمت کی اجتماعی تصدیق شامل تھی۔

☆ اس نسخہ میں تمام آیات آنحضرت کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، البتہ ہر سورہ علاحدہ علاحدہ لکھی گئی تھی۔

☆ یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔

☆ اس میں صرف وہی آیتیں شامل تھیں، جو حضرت جبرئیل نے آپ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری رمضان المبارک میں آپ کو پورا قرآن سناتے وقت پڑھی تھیں اور اسی ترتیب کے مطابق تھیں۔

حضرت ابوبکر کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر کے پاس رہے، حضرت عمر کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت حفصہؓ کے پاس رہے اور حضرت حفصہؓ کے انتقال کے بعد مروان بن الحکیم نے اپنے عہد حکومت میں اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب حضرت عثمان کے دور میں جمع کردہ مصاحف کے رسم الخط پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا، چنانچہ مناسب نہ تھا کہ کوئی ایسا نسخہ باقی رہے جو رسم الخط میں عثمانی مصاحف سے مختلف ہو۔

5.9 جمع قرآن عہد عثمانی میں

حضرت عثمان کے عہد میں جمع قرآن کی نوعیت جاننے سے قبل ایک بنیادی نکتہ سے واقف ہونا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ نبی کریم نے قرآن کریم مختلف طریقوں سے پڑھا ہے، ان مختلف طریقوں کو قرآن کی قراءتیں کہا جاتا ہے اور قرآن میں ان تمام قرأتوں کی گنجائش ہے جو نبی کریم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، نبی کریم نے مختلف صحابہ کو مختلف قرأتوں کے مطابق قرآن کی تعلیم دی تھی۔

جب حضرت عثمان خلیفہ بنے تو اس وقت تک اسلام کی سرحدیں بہت وسیع ہو چکی تھیں اور اسلام دور دراز کے علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ ان ہی صحابہ سے قرآن سیکھتے جو ان کے علاقہ میں موجود تھے، اس طرح مختلف صحابہ سے قرآن سیکھنے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں مختلف قراءتیں رائج ہو گئیں، اب جب وہ لوگ کبھی آپس میں ملتے تو اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط سمجھتے، اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہوتا اور بعض مرتبہ نوبت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے تک پہنچ جاتی، ظاہر ہے کہ حضرت عثمان جیسا دور اندیش خلیفہ اس اہم معاملہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، انھیں متعدد ذرائع سے اس طرح کے واقعات کی اطلاع مل چکی تھی اور خود مدینہ میں بھی اس قسم کے بعض واقعات پیش آئے تھے، چنانچہ انھوں نے جلیل القدر صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور بالآخر وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام اُمت کو ایک مصحف پر جمع کر دیا جائے تاکہ پھر کوئی اختلاف وافتراق پیش نہ آئے۔

حضرت عثمان نے اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جو حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام پر مشتمل تھی، بعد میں چند اور صحابہ کو بھی اس میں شامل کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، اس کمیٹی نے اس کام کے لئے درج ذیل طریقۂ کار اختیار کیا :

1۔ اس مصحف کی تیاری کے لیے انھوں نے بنیادی طور پر حضرت ابوبکر کے زمانہ میں تیار کردہ صحیفہ کو سامنے رکھا، یہ صحیفہ اس وقت حضرت حفصہؓ کی تحویل میں تھا اور حضرت عثمان نے اس کام کے لیے ان سے حاصل کیا تھا۔

2۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جو صحیفہ تیار ہوا تھا، اس میں سورتیں مرتب شکل میں نہ تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ جز میں لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے ایک نسخہ میں آنحضرت کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق سورتوں کو مرتب شکل میں تحریر کیا۔

3۔ اس مرحلہ کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ ان حضرات نے قرآن کریم کو لکھنے کے لیے ایسا رسم الخط منتخب کیا، جس میں قرآن کی تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی غرض سے نہ تو ان پر نقطے لگائے گئے اور نہ ہی اعراب، تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے

مطابق پڑھا جا سکے، یہی وہ اصل کام تھا، جس کے لیے عہد عثمانی میں جمع قرآن کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اس طریق کار کے مطابق قرآن کریم کا جو نسخہ تیار ہوا، اس کی موجودگی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی، کیوں کہ اس نسخہ میں تمام قراءتیں شامل تھیں اور ہر شخص اپنی قراءت کے مطابق ان سے تلاوت کر سکتا تھا۔

اس کمیٹی نے اس نئے مرتب کردہ مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عثمان نے کل پانچ مصحف تیار کرائے تھے، لیکن معروف عالم ابوحاتم سجستانیؒ کی رائے ہے کہ کل سات مصاحف تیار کرائے گئے تھے، ان میں سے ایک مصحف مکہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا اور ایک مدینہ میں محفوظ رکھا گیا، اس طرح پوری اسلامی سلطنت میں ایک ہی نسخہ کو رائج کر دیا گیا۔

قرآن کریم کے یہ معیاری نسخے تیار کرانے اور انھیں پوری اسلامی مملکت میں پھیلا دینے کے بعد حضرت عثمان نے وہ تمام ذاتی نسخے جلا دینے کا حکم دیا جو مختلف صحابہ کے پاس موجود تھے، تاکہ مصحف تیار کرانے کا ان کا مقصد حاصل ہو سکے اور ساری اُمت ایک ہی مصحف پر جمع ہو جائے اور پھر کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک وہی رسم الخط رائج ہے جو حضرت عثمان نے اختیار کیا، اسی لئے اسے ''رسمِ عثمانی'' کہا جاتا ہے اور مصاحف کو اسی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے۔

5.10 تسہیل تلاوت کی کوششیں

عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں جمع قرآن کے ذریعہ اُمت کی اجتماعی تصدیق کے ساتھ حفاظت قرآن کا کام بھی مکمل ہو گیا اور اسلامی ممالک میں اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت بھی عمل میں آئی، اس طرح سے قرآن اپنی مکمل اور محفوظ صورت میں ہر شخص کے پاس پہنچ گیا، لیکن جب اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلام ان لوگوں تک پہنچا جو عربی زبان سے ناواقف تھے، تو انھیں قرآن پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک قرآن میں نہ تو نقطے لگائے گئے تھے اور نہ ہی حرکات کی ضرورت محسوس کی گئی تھی، اسی طرح قراءت قرآن کے درمیان آسانی کے لیے قرآن میں مختلف حصوں کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی، چنانچہ بعد کے ادوار میں جیسے جیسے ضرورت محسوس کی گئی، قراءت قرآن میں آسانی پیدا کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے، جن کے نتیجے میں ہر شخص خواہ وہ عربی زبان سے ناواقف ہی کیوں نہ ہو اس قابل ہو گیا کہ قرآن کو آسانی سے پڑھ سکے،---تسہیل تلاوت کے یہ اقدامات درج ذیل ہیں :

5.10.1 قرآن مجید پر نقطے

شروع میں اہل عرب میں نقطے لگانے کا رواج نہ تھا، بلکہ وہ بغیر نقطوں کے لکھنے اور پڑھنے کے عادی تھے، چنانچہ مصاحف عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، ان مصاحف کے نقطوں سے خالی ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس طرح اس میں تمام متواتر قراءتیں سما سکیں، لیکن جب اسلام غیر عربوں تک پہنچا، تو انھیں بغیر نقطوں کے قرآن پڑھنے میں مشکل پیش آنے لگی، لہٰذا ان کی آسانی کے لئے قرآن پر نقطے لگائے گئے۔

قرآن پر نقطے لگانے کا یہ کام خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں انجام پایا، عبدالملک بن مروان نے یہ اہم کام حجاج بن یوسف کے سپرد کیا تھا اور حجاج بن یوسف نے اسے نصر بن عاصم لیثی اور یحییٰ بن یعمر عدوانی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر نقطے لگانے کا کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے انجام دیا اور یہ کہ عبدالملک بن مروان سے پہلے ابن سیرین کے پاس بھی ایک نقطوں والا قرآن موجود تھا، ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ابوالاسود دؤلیؒ

نے قرآن پر سب سے پہلے نقطے لگائے، لیکن یہ ایک انفرادی عمل تھا اور ان کے ذاتی نسخے تک محدود تھا، پھر اس کے بعد ابن سیرین نے بھی اپنے ذاتی مصحف پر نقطے لگائے، پھر عبدالملک بن مروان کے دور میں یہ کام سرکاری سطح پر انجام پایا، جسے قبولِ عام حاصل ہوا اور اس سے عرب وعجم سب مستفید ہوئے۔

5.10.2 قرآن مجید پر اعراب

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں، کیوں کہ عربوں میں اس کا رواج نہ تھا اور وہ بغیر حرکات کے لکھنے پڑھنے کے عادی تھے، لیکن جب غیر عرب لوگ قرآن پڑھنے میں غلطیاں کرنے لگے تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن پر حرکات لگائی جائیں، چنانچہ سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے حرکات وضع کیں، لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں جیسی آج کل معروف ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ، زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ، پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ اور تنوین کے لئے دو نقطے لگائے گئے، بعد میں خلیل بن احمد نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں۔

اس کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے یحییٰ بن یعمرؒ، نصر بن عاصمؒ اور حسن بصریؒ سے بیک وقت قرآن پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقعہ پر نقطوں اور حرکات میں التباس کے خوف سے ان حضرات نے وہ حرکات وضع کیں جو آج بھی معروف ہیں۔

5.10.3 منزلیں، پارے اور رُکوع

صحابہ کرام کا عام معمول تھا کہ وہ ہفتے میں ایک بار قرآن ختم کرلیا کرتے تھے، انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار متعین کی ہوئی تھی اور قرآن کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا، ان میں سے ہر حصہ کو حزب یا منزل کہا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ سات احزاب کسی معنی اور مفہوم کی رعایت کرتے ہوئے نہیں بنائے گئے تھے، بلکہ محض اس لیے بنائے گئے تھے کہ ہر حصہ ایک دن میں ختم ہوجائے اور اس طرح سات دنوں میں پورا قرآن ختم ہوسکے، ان احزاب کی تقسیم اس طرح تھی کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا سات سورتوں کا، چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، چھٹا تیرہ سورتوں کا اور آخری سورہ ''ق'' سے آخر قرآن تک کا تھا۔

پورے قرآن کو برابر کے تیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ حصے ''اجزا'' یا ''پارے'' کہلاتے ہیں، یہ تقسیم من جانب اللہ نہیں ہے اور عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، حجاج بن یوسف کی امارت (73ھ تا 95ھ) میں یہ تقسیم عمل میں آئی، چنانچہ اس تقسیم کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، اس تقسیم میں قرآن کے معانی ومطالب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ قرآن کو پڑھنے، حفظ کرنے اور قرآن کی تعلیم میں آسانی کی غرض سے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی ہے، بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم نے صحابہ کرام کے لیے یہ بات پسند فرمائی تھی کہ وہ مہینے میں ایک بار قرآن ختم کرلیا کریں، چنانچہ اسی ہدایت کے پیش نظر یہ تقسیم کی گئی تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک جز پڑھ کر مہینے میں ایک قرآن ختم کرنے کا شرف حاصل کرسکے۔

جس طرح پورے قرآن کو تیس مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اسی طرح ہر حصے کو مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ حصے رکوع کہلاتے ہیں، یہ تقسیم معنی کے اعتبار سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام مکمل ہوا وہاں رکوع مکمل ہوگیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ از خود یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کس جگہ تلاوت کا سلسلہ ختم کردینا مناسب ہوگا، چنانچہ ان کی سہولت کے لیے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی، تعیین رکوع کے سلسلہ میں ایک اور بات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور وہ یہ کہ تقسیم میں آیتوں کی ایک مناسب تعداد کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس

طرح ایک پارہ عموماً پندرہ بیس رکوعوں میں منقسم ہے، اس کا مقصد آیات کی ایک ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے، جو ایک رکعت میں پڑھی جا سکے اور اس کو رکوع اسی لیے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، ظاہر ہے کہ اس تقسیم کو بھی کوئی شرعی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

5.10.4 رموز اوقاف

قرآن مجید کی تلاوت میں سہولت کے لیے ایک اہم اور مفید کام یہ کیا گیا کہ آیات کے درمیان ایسی علامتیں مقرر کر دی گئیں، جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ رکنا یا ٹھہرنا کیسا ہے؟ ان علامتوں کو ''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں، ان کی مدد سے ایک عربی سے ناواقف انسان بھی درست طریقہ سے تلاوت کر سکتا ہے اور صحیح جگہ پر ٹھہر سکتا ہے، ان علامات کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ غلط جگہ پر وقف کرنے سے معنی میں بسا اوقات غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، معنی کی اسی تبدیلی سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ علامات وضع کی گئی ہیں، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابوعبداللہ محمد بن طیفور سجاوندیؒ نے وضع فرمائی ہیں، ان میں سے کچھ اہم رموز درج ذیل ہیں :

ط : اس کا مطلب ہے کہ یہاں بات پوری ہوگئی ہے، اس لیے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج : اس کا مطلب ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز : اس کا مطلب ہے کہ یہاں وقف کرنا تو درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

م : یہ وقفِ لازم کا مخفف ہے، یعنی یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہٰذا یہاں وقف کرنا ضروری ہے۔

لا : اس کا مطلب ہے کہ یہاں نہ ٹھہرا جائے اور اگر اس مقام پر وقف کیا جائے تو بہتر ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے۔

قف : اس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، یہ اس جگہ لایا جاتا ہے، جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

5.11 قرآن مجید پریس پر

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے اور ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے کتابتِ قرآن کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا، پھر جب پریس ایجاد ہوا، تو سب سے پہلے 1113ھ میں ہیمبرگ کے مقام پر قرآن کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن یہ نسخے اسلامی دنیا میں مقبول نہ ہو سکے، مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں 1887ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، 1828ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر چھاپا گیا اور پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔

5.12 قرآن مجید سے متعلق ضروری اعداد و شمار

- قرآن مجید کی کل سورتوں کی تعداد : 114
- مکی دور میں نازل ہونے والی سورتوں کی تعداد : 86
- مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتوں کی تعداد : 28

- قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد : 6236
- قرآن مجید کے کل کلمات کی تعداد : 77932
- قرآن مجید کے کل حروف کی تعداد : 332015
- قرآن مجید کے کل اجزا (پارے) کی تعداد : 30
- قرآن مجید کے کل احزاب کی تعداد : 7
- قرآن مجید میں سجدوں کی تعداد : 15

(جن میں سے ایک کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہاں سجدہ کیا جائے گا یا نہیں؟)۔

- قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ : سورہ بقرہ
- قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ : سورہ کوثر
- قرآن مجید کتنے سال کی مدت میں نازل ہوا : تقریباً 22 سال 5 ماہ چودہ دن
- پہلی وحی : سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات
- آخری وحی : سورہ توبہ کی آخری دو آیات
- عہد نبوی میں قرآن مجید کے ان حفاظ کی تعداد، جن کے ناموں کی صراحت ملتی ہے : 42
- کاتبین وحی کی تعداد : 40

5.13 مکی و مدنی سورتیں

قرآن کریم کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی، آخر سورتوں کے مدنی اور مکی ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں وہ مکی اور جو مدینہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی ہیں، لیکن حقیقتاً یہ تقسیم زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے، یعنی نبی کی مدینہ ہجرت سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں، خواہ وہ کسی بھی جگہ نازل ہوئی ہوں۔ اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے کے بعد جو سورتیں نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں، خواہ کسی مقام پر نازل ہوئی ہوں، آیات اور سورتوں کے درمیان مکی اور مدنی کی یہ تقسیم اگرچہ نبی کریم سے مروی نہیں، لیکن بعد میں صحابہ اور تابعین نے آیات اور سورتوں کے بارے میں وضاحت کی کہ فلاں سورہ یا آیت مکی ہے اور فلاں مدنی، اس کے علاوہ بعض دیگر شواہد کی بنیاد پر بھی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی سورہ یا آیت مکی ہے یا مدنی؟ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

مکی اور مدنی سورتیں چوں کہ مختلف حالات اور ماحول میں نازل ہوئیں اور ان کے مخاطب بھی مختلف تھے، اسی لیے ان کے انداز اور اُسلوب میں فرق پایا جاتا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چوں کہ زیادہ تر عرب کے بُت پرستوں سے تھا اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لیے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بُت پرستوں کی مدلل تردید، مظاہر فطرت پر غور و فکر کی دعوت اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا۔

5.13.1 مکی سورتوں کی خصوصیات

مکی سورتوں کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں :

1۔ مکی سورتوں میں عام طور سے مشرکین اور بُت پرستوں کو خطاب کیا گیا ہے اور اہل کتاب اور منافقین کو مخاطب نہیں بنایا گیا ہے۔

2۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر ونشر کی منظر کشی، آنحضرت کو صبر وتسلی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، ان سورتوں میں احکام وقوانین بہت کم بیان ہوئے ہیں۔

3۔ مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں اور ان کا اُسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، ان میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔

اس کے علاوہ مکی سورتوں کی پہچان کے لیے بعض علما کے نزدیک چند مخصوص علامات بھی ہیں جو درج ذیل ہیں :

1۔ مکی سورتوں میں عموماً ''**یا ایھا الناس** ''(اے لوگو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

2۔ ہر وہ سورہ جس میں لفظ ''کلا'' (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں 33 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

3۔ ہر وہ سورہ جس میں کوئی سجدے کی آیت آئی ہے، مکی ہے۔

4۔ سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورہ جس میں آدم وابلیس کا واقعہ آیا ہے وہ مکی ہے۔

5.13.2 مدنی سورتوں کی خصوصیات

مدینہ طیبہ میں چوں کہ ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے، بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لیے یہاں احکام وقوانین اور حدود وفرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی اور اسی کے مناسب اُسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

مدنی آیات اور سورتوں کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں :

1۔ مدنی سورتوں میں زیادہ تر خطاب اہل کتاب اور منافقین سے ہے۔

2۔ مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد وقتال کے احکام اور حدود وفرائض بیان کیے گئے ہیں۔

3۔ مدنی آیات اور سورتیں طویل اور مفصل ہیں اور ان کا اُسلوبِ بیان مکی سورتوں کی بہ نسبت سادہ ہے اور ان کا ذخیرۂ الفاظ مکی سورتوں کی طرح وسیع نہیں۔

اس کے علاوہ مدنی سورتوں کی بعض علامات درج ذیل ہیں :

1۔ مدنی سورتوں میں عموماً ''**یا ایھا الذین آمنوا** ''(اے ایمان والو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

2۔ ہر وہ سورہ جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

3۔ ہر وہ سورہ جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

5.14 خلاصہ

- قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا وہ کلام معجز ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور بغیر شبہ کے تواتر کے ساتھ نقل ہوا ہے۔
- قرآن مجید ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل ہے اور اس کی سورتیں اور آیتیں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم

نے متعین فرمائی ہیں۔

- نزولِ قرآن کا آغاز اگست 610ء میں ہوا، اور تقریباً 23 سال کی مدت میں پورا قرآن نازل ہوا۔
- عہد نبوی ہی میں بہت سے صحابہ وصحابیات قرآن مجید کے حافظ تھے اور تحریری طور پر بھی قرآن جمع ہو چکا تھا۔
- عہد صدیقی میں حافظوں کے علاوہ قرآنی نوشتوں کی مدد سے ایک جگہ پورا مصحف مرتب کیا گیا، البتہ اس میں ہر سورہ الگ الگ دفتروں میں تھی۔
- حضرت عثمان غنی نے دوبارہ قرآن مجید کو حفاظ اور صحابہ کے نوشتوں سے جمع کیا اور اس انداز پر کتابت کرائی کہ وہ مختلف قرأتوں کو شامل ہو۔
- عبدالملک بن مروان کے عہد میں قرآن پر نقطے لگوائے گئے اور حرکتیں دی گئیں اور ابوالاسود دؤلی کو اس خدمت کا اعزاز حاصل ہوا۔
- صحابہ کے دور میں قرآن کو سات احزاب اور حجاج بن یوسف کے عہد میں 30 پاروں میں تقسیم کیا گیا، اور بعد کے لوگوں نے رکوع مقرر کیے، نیز ابوعبداللہ محمد بن طیفور سجاوندی نے رموز اوقاف متعین کیے۔ قرآن کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی۔ اور مضامین واُسلوب کے اعتبار سے دونوں کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔

5.15 نمونۂ امتحانی سوالات

مختصر جوابی سوالات:

1۔ قرآن کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کے موضوع کی وضاحت کیجئے۔
2۔ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی تقسیم کی وضاحت کے ساتھ اس کی پہلی اور آخری آیت پر روشنی ڈالئے۔
3۔ عہد عثمانی میں جمع قرآن کا اجمالی جائزہ پیش کیجئے۔
4۔ قرآن کریم کی منزلیں، پارے اور رکوع پر گفتگو کیجئے۔

طویل جوابی سوالات:

1۔ عہد نبوی میں جمع قرآن کی تاریخ پر روشنی ڈالیے۔
2۔ عہد صدیقی میں جمع قرآن پر ایک نوٹ لکھئے۔
3۔ قرأت قرآن میں آسانی پیدا کرنے کے لیے کیا اقدامات کئے گئے؟ مفصل لکھئے۔
4۔ مکی اور مدنی سورتوں میں کیا فرق ہے؟ ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ بیان کیجیے۔

5.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1۔ علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی
2۔ علوم القرآن : ڈاکٹر صبحی صالح (ترجمہ: غلام احمد حریری)
3۔ مناھل العرفان فی علوم القرآن : دکتور عبدالعظیم زرقانی
4۔ الإتقان فی علوم القرآن : جلال الدین سیوطی

5۔ جمع قرآن : مولانا عبداللطیف رحمانی

ـ:oOo:ـ

اکائی 6 : قرآنی تعلیمات

اکائی کے اجزاء

6.1 مقصد

6.2 تمہید

6.3 قرآن کی معاشی تعلیمات

6.4 قرآن کی معاشرتی تعلیمات

6.5 قرآن کی سیاسی تعلیمات

6.6 قرآن اور بین قومی تعلقات

6.7 قرآن کی اخلاقی تعلیمات

6.7.1 اچھے اخلاق

6.7.2 بُرے اخلاق

6.8 خلاصہ

6.9 نمونۂ امتحانی سوالات

6.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

6.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہوں گے کہ قرآن کریم میں کس طرح کی تعلیمات ذکر کی گئی ہیں۔ زندگی کے مختلف میدانوں کے بارے میں قرآن کی اصولی ہدایات سے انھیں آگاہی ہوگی، اور وہ جان سکیں گے کہ قرآن کے پیش کردہ معاشی تصورات کیا ہیں؟ معاشرتی زندگی کے تعلق سے کن حقوق واحکام کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے، سیاسی زندگی اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں قرآن کی ہدایات کیا ہیں اور قرآن کریم انسانوں کو کن اخلاقی اوصاف وفضائل سے آراستہ کرنا اور کن بری باتوں سے بچانا چاہتا ہے؟

6.2 تمہید

قرآن مجید اس زمین پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت اور بندوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے، یہ انسانیت کے لئے ایک جامع ترین ہدایت نامہ اور زندگی کے ہر گوشے سے متعلق تعلیمات پر مشتمل ایک مکمل دستور ہے، اس کی تعلیمات میں الٰہیات کے ضروری حقائق اور دین کے اُصول وقواعد کی تفصیل بھی ہے اور انسانی آداب واخلاق کی تشریح بھی، فرد کی تربیت کے خطوط بھی ہیں اور معاشرہ کی تعمیر کے اُصول بھی، خاندانی

،معاشرتی، تمدنی، معاشی اور سیاسی احکام بھی ہیں اور صلح و جنگ کے آداب وقوانین بھی، ان تعلیمات میں غایت درجہ اعتدال، عقلیت اور فطرت سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اسی لیے یہ ہر قوم، ہر زمانہ اور ہر ملک کے لیے یکساں طور پر موزوں ہیں، یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گذر جانے کے باوجود آج بھی یہ تعلیمات حیاتِ انسانی کے تمام مسائل کا صحیح حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

زیرِ نظر اکائی میں قرآن کریم کی چند اہم تعلیمات درج کی گئی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے قرآن کی معاشی تعلیمات بیان کی گئی ہیں، پھر سماجی زندگی سے متعلق احکام و آداب کو معاشرتی تعلیمات کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ سیاسی تعلیمات کے ضمن میں انسانی حقوق کی بابت اور بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قرآن کی ہدایات ذکر کی گئی ہیں۔ آخر میں اخلاقی تعلیمات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلے فضائل کو پھر بری عادتوں اور رذائل کو بیان کیا گیا ہے۔

6.3 قرآن کی معاشی تعلیمات

اس روئے زمین پر انسان کی فطری اور لازمی ضرورتوں میں سے ایک معاشی ضرورت بھی ہے، چنانچہ قرآن نے انسان کے معاشی مسئلہ سے بھی بحث کی ہے، اس نے انسان کے معاشی نظام پر قدغن نہیں لگائی، بلکہ اس کے لیے صحیح خطوط فراہم کیے ہیں، قرآن کی اہم معاشی تعلیمات درج ذیل ہیں :

☆ خرید و فروخت درست ہے اور یہ حلال طریقہ پر ہونی چاہیے، غلط طریقوں سے مال کمانا جائز نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمنُوْا لَا تَأكُلُوْا أمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إلَّا أنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ . (29:4)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں۔

☆ تجارت اور معاش میں کھو کر انسان کو اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو جانا چاہیے۔

''رِجَالٌ لاَ تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَلاَ بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ''۔(37:24)

کامیاب وہ لوگ ہیں جنھیں خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر دیتی۔

☆ اُجرت پر کام کرنا درست ہے اور انبیا نے بھی اسے ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کیا ہے۔

''قَالَ إِنِّيْ أُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْن عَلٰى اَنْ تَاجُرَنِيَ ثَمَانِيَ حِجَج''۔(27:28)

انھوں نے (موسیٰ سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو۔

دوسری جگہ ہے : **''قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا''**۔(77:18)

(موسیٰ نے) کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کچھ اُجرت ہی لے لیتے۔

☆ رہن کے معاملات درست ہیں اور رہن رکھی جانے والی چیز پر جب تک مرتہن کا قبضہ نہیں ہو جاتا، رہن منعقد نہیں ہوتا۔

''وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِباً فَرِهٰنٌ مَقْبُوْضَةٌ''۔(283:2)

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو۔

☆ جس شخص کے پاس کوئی امانت ہو، اس کی ذمہ داری ہے کہ بحفاظت امانت واپس کرے۔

''اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُوَدُّوْا الْاَمَانَاتِ إِلٰی أَھْلِھَا''۔(58:4)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کو ان کی امانتیں پہنچاؤ۔

''فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضاً فَلْیُؤَدِّ الَّذِیْ اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہُ وَلْیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہُ''۔(283:2)

اگر تم ایک دوسرے کے پاس امانت رکھو، تو جس کے پاس امانت رکھی جائے وہ اسے ادا کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے۔

☆ امانت میں خیانت کرنا قبیح فعل ہے اور ممنوع ہے۔

''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمَانَاتِکُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''۔(27:8)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت کرو۔

☆ قرآن ناپ تول میں ایمانداری کی تعلیم دیتا ہے اور کم تولنے کو زمین میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنے کے مترادف قرار دیتا ہے۔

''فَاَوْفُوْا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلاَ تَبْخَسُوْا النَّاسَ أَشْیَاءَ ھُمْ وَلاَ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ إِصْلاحِھَا''۔(85:7)

ناپ تول میں کمی نہ کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر مت دو اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ برپا کرو۔

☆ ترازو یا پیمانہ بالکل درست ہونا چاہیے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔

''وَأَوْفُوْا الْکَیْلَ إِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْم''۔(35:17)

جب تم تولو تو پورا تولو اور صحیح ترازو سے وزن کرو۔

☆ دوسروں کو کم دینے والے اور ان سے پورا لینے والے تباہی سے دوچار ہوں گے اور انجام کار گھاٹے میں رہیں گے۔

''وَیْلٌ لِلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ إِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ، وَإِذَا کَالُوْھُمْ أَوْوَزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ''۔(83:1-3)

تباہی و بربادی ہے کم کرنے والوں کے لیے جو لوگوں سے تول کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب انھیں ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔

''اَوْ فُوْا الْکَیْلَ وَلاَ تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ''۔(26:181)

پورا پورا تولو اور کم تولنے والوں میں سے نہ بنو۔

☆ قرآن قرض کے لین دین سے متعلق اہم ہدایات دیتا ہے، اس میں پہلی ہدایت یہ ہے کہ قرض لوٹانے کی مدت متعین ہو۔

''یَا اَیُّھَا الَّذِینْ آمَنُوْا إِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ إِلیٰ أَجَلٍ مُسَمَّی فَاکْتُبُوْہُ ''۔(2:282)

اے ایمان والو! جب تم قرض کا معاملہ کرو ایک متعینہ مدت تک، تو اسے لکھ لو۔

☆ اس سلسلہ میں دوسری ہدایت یہ ہے کہ قرض چھوٹا ہو یا بڑا اسے لکھنے میں کوتاہی نہ کی جائے۔

''یَا اَیُّھَا الَّذِینْ آمَنُوْا إِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ إِلیٰ أَجَلٍ مُسَمَّی فَاکْتُبُوْہُ وَلاَ تَسْئَمُوْا أَنْ تَکْتُبُوْہُ صَغِیْراً أَوْ کَبِیْراً إِلٰی اَجَلِہِ
''۔(2:282)

اے ایمان والو! جب تم قرض کا معاملہ کرو، ایک متعینہ مدت تک، تو اسے لکھ لو اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا اس کے لکھنے میں کاہلی نہ کرو اس کی متعین مدت تک۔

☆ اس سلسلہ کی ایک اور ہدایت یہ ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو اس معاملہ کا گواہ بنا لیا جائے۔

''وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَارَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَءَ تَانِ ''۔(282:2)

اورمردوں میں سے دولوگوں کواس کا گواہ بنالواوراگر دومرد نہ ہوں توایک مرداوردوعورتوں کو۔

☆ ان ہدایات کا مقصد یہ ہے کہ اس طریقہ سے ثبوت پختہ ہوجاتے ہیں اورشک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، نتیجتاً تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

''ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنٰى أَلَّا تَرْتَابُوْا''۔(282:2)

یہ اللہ کے نزدیک انصاف کی راہ ہے اورشہادت کی بہترین صورت ہے اوراس سے تمہارے شک وشبہ میں پڑنے کے مواقع باقی نہیں رہتے۔

☆ قرآن صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اورانبیا کوصنعتوں کی جوتعلیم دی گئی اسے خدا کی جانب سے فضل وانعام شمار کرتا ہے۔

''وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِنْ بَاْسِكُمْ ''۔(8:21)

اورہم نے داؤدکوتمہارے جنگی لباس بنانے کا طریقہ بتایا تا کہ تمہیں تمہاری جنگوں سے محفوظ رکھ سکے۔

''وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلاً يٰجِبَالُ أَوِّبِىْ مَعَهُ وَالطَّيْرَ وَاَلَنَّالَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَل سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِىْ السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ''۔(۳۴:۱۰-۱۱)

اورہم نے داؤدکواپنے خاص فضل سے نوازا،(ہم نے کہا)اے پہاڑ اور پرندو!اس کے ساتھ پڑھو،اورہم نے اس کے لیے لوہے کونرم کردیا کہ اس سے کشادہ زرہیں بناؤاوراندازے سے جوڑ کرکڑیاں بناؤاور بھلائی کے کام کرو۔

☆ سودحرام ہےاورتمام سودی کاروبار ناجائز ہیں۔

''اَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا''۔(275:2)

اللہ نے تجارت کوحلال اورسودکوحرام قرار دیا ہے۔

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَابَقِىَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ''۔(278:2)

اےایمان والو!اللہ سے ڈرواورجوذرا بھی سود باقی رہ گیا ہےاسے چھوڑ دواگرتم واقعی مومن ہو۔

☆ سودکی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ بڑھتا چلا جاتا ہےاور بسااوقات اصل مال سے کئی گناہ زیادہ ہوجاتا ہے۔

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً ''۔(13:3)

اےایمان والو!سودنہ کھاؤ کئی کئی گنا۔

☆ ہرمال جوغلط طریقہ سے کمایا جائے حرام ہے،خواہ وہ غصب کے ذریعہ کمایا گیا ہو،یارشوت لےاوردے کرحاصل کیا گیا ہو۔

'' وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَاكُلُوْا فَرِيْقاً مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''۔(188:2)

آپس میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقہ سے نہ کھاؤاور حاکموں تک مال اس غرض سے نہ پہنچاؤ کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں کا مال گناہ کرتے ہوئے کھاسکودراں حالاں کہ تم اس سے واقف ہو۔

☆ قرآن ذخیرہ اندوزی کوناقابل معافی جرم قرار دیتا ہےاورایسا کرنے والوں کوسخت عذاب کی وعید سناتا ہے۔

’’ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلاَ یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ‘‘۔(34:9)
جولوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں دردناک عذاب کی خبر سنادو۔
’’وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ O اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ یَحْسَبُ أَنَّ مَالَہٗ أَخْلَدَہٗ ‘‘۔(104:1-2)
تباہی ہے ہر غیبت کرنے والے اور عیب لگانے والے کی جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ اس کی دولت اس کو ہمیشہ رکھے گی۔

☆ قرآن دولت کے ارتکاز کو پسند نہیں کرتا، دولت کے ارتکاز ہی کو روکنے کے لیے اس نے صدقہ وخیرات کا نظام پیش کیا ہے۔
’’کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْأَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ‘‘۔(59:7)
تا کہ یہ دولت صرف تمہارے دولت مندوں ہی تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

☆ اسلام ضرورت مندوں کے درمیان مال خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو اپنا مال محتاجوں میں خرچ کرتے ہیں۔
’’ وَفِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ‘‘۔(51:19)
اور ان کے مال میں سائلوں اور محتاجوں کا حصہ ہے۔

☆ قرآن انفاق پر اُبھارتے ہوئے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، کہ انسان کا سارا مال اسی دنیا میں رہ جانے والا ہے، اور اسے بالآخر ایک ایسے دن کا سامنا کرنا ہے جب کوئی مال اور دولت کام آنے والی نہیں۔
’’یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاکُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ یَّاتِیَ یَوْمٌ لاَ بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَلَا شَفَاعَۃٌ ‘‘۔(2:254)
اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی فروخت ہوگی، نہ دوستی اور نہ ہی کوئی سفارش۔

☆ قرآن انفاق یعنی ضرورت مندوں پر خرچ کرنے میں بھی اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔
’’وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمَسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْراً ‘‘۔(17:26)
قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو اور بہت زیادہ فضول خرچی نہ کرو۔
’’وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلاَ تُلْقُوْا بِأَیْدِیْکُمْ إِلَی التَّھْلُکَۃِ ‘‘۔(2:195)
اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

☆ قرآن ان لوگوں کو اللہ کے حقیقی فرمانبردار بندوں میں شمار کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، نہ تو کنجوسی کرتے ہیں اور نہ ہی بہت زیادہ اسراف کرتے ہیں، بلکہ میانہ روی سے خرچ کرتے ہیں۔
’’وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَاماً ‘‘۔(25: 67)
وہ لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں، تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی کنجوسی کرتے ہیں، وہ میانہ روی سے خرچ کرتے ہیں۔

☆ قرآن فضول خرچی کو ناپسند کرتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو شیطان کا معاون قرار دیتا ہے۔
’’اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنِ ‘‘۔(17:27)

فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

☆ قرآن والدین، اعزہ واقربا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں مال خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

''قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ''۔(215:2)

کہہ دو کہ جو مال تم خرچ کرو تو وہ والدین کے لیے، قریبی رشتہ داروں کے لیے، یتیموں کے لیے مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے۔

☆ قرآن اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ معاشی ورزقی اعتبار سے مراتب ومدارج کا اختلاف قدرتی تقسیم ہے اور معاشی نظام کے جاری رہنے کے لیے ضروری ہے۔

''نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضاً سُخْرِيًّا ''۔(32:43)

ہم نے ان کی دنیوی زندگی کی روزی ان میں تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے، تا کہ ایک دوسرے کو ماتحت کر لے۔

☆ ایمان وتقویٰ، توبہ واستغفار اور شکر سے آسمانی برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

''وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَاراً وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ''۔(52:11)

اے قوم کے لوگو! اپنے رب سے گناہوں کی معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹو وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش نازل کرے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ کرے گا۔

''وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَاَنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ''۔(7:14)

اور جب تمہارے پروردگار نے تمہیں آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر گزاری کرو گے تو بے شک میں تمہیں زیادہ دوں گا۔

☆ کفر واعراض کی روش اختیار کرنے کا نتیجہ معاشی تنگی وبدحالی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

''وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ''۔(124:20)

اور جو میری یاد سے روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگی میں رہے گی۔

6.4 قرآن مجید کی معاشرتی تعلیمات

☆ سارے انسان برابر ہیں، مرد کو عورت پر یا کسی گروہ کو دوسرے گروہ پر پیدائشی بنیاد پر فضیلت حاصل نہیں۔

''يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاكُمْ ''۔(13:49)

اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں سب سے بہتر اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔

☆ عمل کے اعتبار سے مرد وعورت دونوں برابر ہیں، اور کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں۔

''اَنِّىْ لَا اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ ''۔(195:3)

میں تم میں سے کسی محنت کرنے والے کی محنت ضائع نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہو۔

☆ قرآن نکاح کی ترغیب دیتا ہے اور محض معاشی پس ماندگی کے خیال سے نکاح میں تاخیر کو پسند نہیں کرتا۔

”وَأَنْكِحُوا الاَيَامىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَآئِكُمْ إِنْ يَكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ“۔(32:24)

اور تم میں سے جو کنوارے ہوں اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو نیک ہوں، ان کا نکاح کر دو، اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا۔

☆ جو لوگ کسی وجہ سے نکاح نہ کر سکتے ہوں، انھیں چاہیے کہ وہ صبر وضبط کا دامن تھامے رہیں۔

”وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لاَ يَجِدُوْنَ نِكَاحاً حَتّٰى يُغْنِيَهِمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ“۔(33:24)

اور اپنے آپ کو بچاتے رہیں وہ لوگ جو نکاح نہیں کر سکتے یہاں تک کہ اللہ انھیں اپنے فضل سے بے نیاز کر دے۔

☆ قرآن زیادہ سے زیادہ چار نکاح کی اجازت دیتا ہے، لیکن اگر بیویوں کے درمیان انصاف ممکن نہ ہو تو ایک ہی نکاح کی تلقین کرتا ہے۔

”فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً“۔(3:4)

تمھیں جو عورتیں پسند آئیں ان سے شادی کر لو، دو، تین، چار، لیکن اگر تمھیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی سے نکاح کرو۔

☆ قرآن نکاح کے سلسلے میں عورتوں کی رائے کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور انھیں اس بات کا حق دیتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق نکاح کریں۔

”فَلاَ تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ“۔(232:2)

تو اب ان کو نہ روکو کہ وہ اپنی پسند کے شوہر سے نکاح کر لیں، جب وہ آپس میں راضی ہو جائیں دستور و رواج کے مطابق۔

”فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ“۔(234:2)

جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو رواج کے مطابق اپنے حق میں جو بھی کریں، تم پر کوئی گناہ نہیں۔

☆ اہل کتاب عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے۔

”وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُوْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ“۔(5:5)

تمہارے لیے حلال ہیں، پاکباز مسلمان عورتیں اور وہ پاکباز عورتیں جن کے پاس تم سے پہلے کتاب آچکی ہے، جب کہ تم انھیں ان کے مہر ادا کر دو۔

☆ وہ عورتیں جن سے نکاح کرنا ممنوع ہے، قرآن کی ان آیتوں میں بیان ہوئی ہیں۔

”وَلاَ تَنْكِحُوْا مَانَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلاَّ مَاقَدْ سَلَفَ إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتاً وَسَآءَ سَبِيْلاً، حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالاَتُكُمْ وَبَنٰتُ الاَخِ وَبَنَاتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِيْ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِي فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَائِكُمُ اللاَّتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ

تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلآئِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلاَّ مَاقَدْ سَلَفَ إِنَّ اللهَ كَانَ غَفُوْراً رَّحِيْماً ''۔(4:22-23)

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں، انھیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ، مگر جو ہو چکا ہے، یہ بے حیائی اور غضب کا کام ہے اور بدترین راہ ہے، تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھائی اور بہن کی بیٹیاں، تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، تمہاری دودھ شریک بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور ان کی وہ بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں اور جو تمہاری ان بیویوں سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، کہ اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی ہے تو کوئی حرج نہیں، تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشت سے ہیں اور دو بہنوں کو اکٹھا کرنا، مگر جو ہو چکا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

☆ مسلمان مردوں کا مشرک عورتوں سے نکاح جائز نہیں، اسی طرح مسلمان عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح بھی ناجائز ہے۔

''وَلَا تَنْكِحُوْا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوْا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا''۔ (2:221)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور مومن باندی مشرکہ سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمہیں اچھی لگے اور مشرک مردوں سے نکاح مت کرو جب تک ایمان نہ لے آئیں۔

☆ نکاح کے بعد عورت کی عصمت و آبرو کے احترام کے طور پر مہر واجب ہوتا ہے، جو شوہر کو ادا کرنا ضروری ہے۔

''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ''۔(4:24)

تم نے جو ان عورتوں سے فائدہ اٹھایا ہے، تو ان کو ان کے مقرر کردہ حق (مہر) دو اور مقرر کرنے کے بعد تم باہمی رضامندی سے جو طے کر لو اس میں کوئی حرج نہیں۔

''وَاٰتُوْا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ''۔(4:4)

اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی خوشی دے دو۔

☆ قرآن مردوں کو عورتوں کے ساتھ معاشرت بالمعروف کی ہدایت دیتا ہے اور اگر کوئی چیز ناگوار گزرے تو اسے نظر انداز کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

''وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسىٰ أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللهُ فِيْهِ خَيْراً كَثِيْراً ''۔(4:19)

اور ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو اور اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسے خوب خیر کا ذریعہ بنا دے۔

☆ اگر کوئی ایسی صورت حال پیش آ جائے کہ میاں بیوی دونوں کا ایک ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہ ہو، تو قرآن ایسے موقع کے لیے شوہر کو طلاق کا حق دیتا ہے، لیکن اس وقت بھی اسے حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔

''وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ''۔(2:231)

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت تک پہنچ جائیں تو ان کو بھلے طریقے سے روک لو یا اچھے طریقے سے رخصت کر دو۔

☆ بعض صورتوں میں عورت کو بھی یہ اختیار ہے کہ وہ کچھ دے دلا کر شوہر سے الگ ہو جائے، اسے خلع کہتے ہیں۔

''فَإِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ''۔(229:2)

اگر تم لوگوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کے حدود کی پاسداری نہ کر سکیں گے تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، اس میں جو عورت بدلے میں دے کر الگ ہو جائے۔

☆ عورت اور مرد میں سے کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں، لیکن ایک خاندان کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے ایک ذمہ دار کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ذمہ داری مرد کو سونپی گئی ہے۔

''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ''۔(228:2)

اور عورتوں کو بھی حق حاصل ہے جیسے کہ ان پر حقوق عائد ہوتے ہیں، دستور کے مطابق البتہ مردوں کو ان پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ''۔(34:4)

مرد عورتوں پر ذمہ دار ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

☆ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کے رہنے، کھانے، پہننے کا انتظام کرے اور اپنے مقدور کے مطابق اس کی ضروریات پوری کرے۔

''اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلاَ تُضَارُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ وَاِنْ كُنَّ اُوْلَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى O لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللهُ''۔(65:6-7)

ان کو رہنے کے لئے گھر دو جہاں تم خود رہو اپنے مقدور کے مطابق اور انھیں تکلیف نہ پہنچاؤ تا کہ ان پر گرفت رکھو، اور اگر وہ حمل سے ہوں تو ان پر خرچ کرو جب تک بچہ نہ جن دیں، پھر اگر وہ تمہاری خاطر دودھ پلائیں تو انھیں ان کی مزدوری دو اور آپس میں بھلے طریقے کی تعلیم دو، اور اگر تم آپس میں ضد کرو تو کوئی اور عورت اسے دودھ پلائے، چاہیے کہ دولت مند شخص اسی لحاظ سے خرچ کرے، اور جس کی روزی محدود ہے وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔

☆ اگر شوہر بیوی کی جانب سے نافرمانی محسوس کرے تو وہ اسے سمجھائے، اگر پھر بھی نہ مانے تو بستر الگ کر دے اور اگر کوئی طریقہ کارگر نہ ہو تو اخیر میں ہلکی پھلکی مار کی بغرض اصلاح گنجائش ہے۔

''وَاللّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلاَ تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً ''۔(34:4)

اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور ان کے بستر الگ کر دو اور مارو، پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر الزام کی راہ مت تلاش کرو۔

☆ اگر شوہر و بیوی میں رنجش ہو جائے اور وہ آپس میں اسے حل نہ کر سکیں تو چاہیے کہ دونوں کی جانب سے ایک ایک حَکَم متعین کیے جائیں، جو ان کے درمیان صلح کرا دیں۔

''وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَماً مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَماً مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا ''۔(35:4)

اگر تمہیں ان کے درمیان رنجش کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کی جانب سے اور ایک حکم عورت کی جانب سے متعین کرو، اگر وہ صلح چاہیں گے تو اللہ انھیں اس کی توفیق دے گا۔

☆ عورتوں کی اصل جگہ ان کا اپنا گھر ہے اور ان کے لئے بلاضرورت گھر سے نکلنا بہتر نہیں۔

''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلیٰ ''۔(33:33)

اپنے گھروں میں رہو اور اس طرح نہ دکھاتی پھرو جیسا کہ پہلے نادانی کے وقت دستور تھا۔

☆ اگر ضرورت کے تحت انھیں باہر نکلنا پڑے تو انھیں اپنی نگاہیں نیچی رکھنی چاہیے، اپنا بدن چادر سے ڈھک لینا چاہیے اور زیب و زینت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

''وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلاَ یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ إِلاَّ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ''۔(31:24)

مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی ستر تھامتی رہیں اور اپنی زیب و زینت ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو ظاہر ہو جائے اور اپنے گریبان پر اپنی چادر ڈال لیں۔

اس پردے کا فائدہ یہ ہے کہ جب لوگ انھیں دیکھیں تو پہچان لیں کہ یہ پاکدامن عورتیں ہیں اور ان کی طرف غلط نظر نہ ڈالیں۔

''یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلاَبِیْبِهِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ یُعْرَفْنَ فَلاَ یُؤْذَیْنَ ''۔(59:33)

اے نبی ﷺ! اپنی عورتوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیا کریں، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں۔

☆ عورتیں اپنی زینت کچھ لوگوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں، جن سے ہمیشہ واسطہ رہتا ہے اور جن سے مکمل پردہ باعث مشقت ہے، وہ لوگ درج ذیل ہیں :

''وَلاَ یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ إِلاَّ لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ اٰبَائِهِنَّ اَوْ اٰبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِیْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْبَنِیْ اَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَاءِ هِنَّ أَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِیْنَ غَیْرِ اُوْلِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلاَ یَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ''۔(31:24)

اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہر کے سامنے یا اپنے باپ کے یا شوہر کے باپ کے یا اپنے بیٹے کے، یا خاوند کے بیٹے کے یا اپنے بھائی کے، یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں اور باندیوں کے یا بے غرض ملازموں کے، یا لڑکوں کے سامنے جو ابھی سن شعور کو پہنچے، اور وہ اپنے پیروں کو زمین پر نہ ماریں کہ ان کی پوشیدہ زینتیں ظاہر ہو جائیں۔

☆ اہل خانہ اور اولاد کی صحیح تربیت کرنا اور انھیں غلط راستے سے روکنا ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔

''یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَأَهْلِیْکُمْ نَاراً ''۔(6:66)

اے ایمان والو! خود کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

☆ قرآن والدین سے حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر وہ خدا کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی

تاکید کرتا ہے، اگر وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو جھڑکنے حتی کہ اُف تک کہنے سے منع کرتا ہے اور ان کی اطاعت کی ہدایت دیتا ہے۔

''وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلاَ تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً ''۔(36:4)

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین سے حسن سلوک کرو۔

''قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلاَ تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيْماً ، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىْ صَغِيْراً''۔ (۲۴:۱۷)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو ''اُف'' نہ کہو اور انھیں نہ جھڑکو اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرو، اور ان کے سامنے عاجزی سے جھک جاؤ اور پیار کا سلوک کرو اور کہو کہ اے رب! ان پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔

☆ قرآن صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور قرابت داروں سے حسن سلوک کا معاملہ کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔

''وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ''۔(1:4)

اللہ سے ڈرتے رہو جس کا تم آپس میں واسطہ دیتے ہو اور رشتوں ناتوں کا خیال رکھو۔

''اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِىْ الْقُرْبٰى ''۔(90:16)

اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا اور حسن سلوک کا اور قرابت داروں کو نوازنے کا۔

اسی طرح رشتے ناتے توڑنے کو فساد فی الارض سے تعبیر کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو خدا کی لعنت کا مستحق قرار دیتا ہے۔

''فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ ، اُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ''۔(23،22:47)

پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت ملے تو تم زمین میں فساد برپا کرو گے اور اپنے ناتے توڑو گے، ایسے ہی لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

☆ قرآن والدین اور قرابت داروں کے ساتھ ساتھ یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، سفر کے ساتھیوں اور مسافروں سے بھی حسن سلوک کا حکم دیتا ہے۔

''وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً وَبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِىْ الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ''۔(36:4)

والدین، قرابت داروں، یتیموں، فقیروں، قریبی پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں، برابر کے رفیقوں اور راہ کے مسافروں سے حسن سلوک کرو

۔

☆ دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے سے قبل اجازت لینی ضروری ہے اور اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلا جانا بہتر ہے۔

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَانِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى أَهْلِهَا ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ، فَاِنْ لَمْ تَجِدُوْا فِيْهَا اَحَداً فَلاَ تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ''۔(28-27:24)

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو، جب تک تمہارے آنے کی اطلاع نہ ہو جائے اور تم انھیں سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، شاید کہ تم یاد رکھو، پھر اگر تم اس گھر میں کسی کو نہ پاؤ تو اس میں نہ جاؤ جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے، اور اگر تم سے واپس ہونے کے لیے کہا جائے تو واپس ہو جاؤ، یہی تمہارے لیے صاف ستھری بات ہے۔

☆ یہ بات مجلس کے آداب میں سے ہے کہ مجلس میں نئے آنے والوں کو جگہ دی جائے۔

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا ''۔ (11:58)

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کشادہ ہو کر بیٹھو تو کشادہ ہو جاؤ، اللہ تمہیں کشادگی عطا کرے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو۔

☆ قرآن خودکشی کو حرام قرار دیتا ہے: ''وَلاَ تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ''۔ (29:4)

☆ مفلسی کے خوف سے اولاد کو مار ڈالنا بہت بڑا جرم ہے اور ایسا کرنے والے صریح نقصان میں ہیں، کیوں کہ وہی خدا جو انھیں روزی فراہم کرتا ہے، ان کے بچوں کے رزق کا انتظام بھی کرے گا۔

''وَلاَ تَقْتُلُوْا اَوْلاَدَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاَقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْراً ''۔(31:17)

اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مارو، ہم انھیں روزی دیں گے اور تمہیں بھی، بے شک ان کو مارنا بہت بڑا جرم ہے۔

''قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلاَدَهُمْ سَفَهاً بِغَيْرِ عِلْمٍ ''۔(140:6)

وہ لوگ گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو بلا سمجھے بوجھے نادانی سے مار ڈالا۔

☆ وہ غیر مسلم جو مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتے اور انھیں بے گھر کرنے کی کوششیں نہیں کرتے، ان سے حسن سلوک اور عدل وانصاف کا برتاؤ کیا جائے گا۔

''لاَ يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ''۔(8:60)

وہ لوگ جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے بے گھر نہیں کیا، اللہ تمہیں ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے منع نہیں کرتا اور نہ ہی ان کے ساتھ عدل وانصاف سے روکتا ہے، اللہ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

☆ وہ غیر مسلم جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں، ان کے دین کے معاملہ میں ان سے لڑائیاں کرتے اور زور زبردستی کرتے ہیں، انھیں ان کے گھروں سے بے گھر کرتے ہیں اور ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں رکھے جائیں گے۔

''إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ ''۔ (9:60)

اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے لوگوں کو دوست بنانے سے منع کرتا ہے، جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ کی ہے، تمہیں اپنے گھروں سے نکالا ہے اور تمہیں نکالنے کے لیے آپس میں اتحاد کرلیا ہے۔

☆ قرآن مسلمانوں کواس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے معبودوں کو برا بھلا کہیں۔

''وَلاَ تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوْا اللّٰهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ ''۔(109:6)

جنھیں (مشرکین) اللہ کے سوا پکارتے ہیں انھیں برا بھلا نہ کہو کہ کہیں وہ مخالفت میں نادانی کے ساتھ اللہ کو برا بھلا کہہ بیٹھیں۔

6.5 قرآن مجید کی سیاسی تعلیمات

☆ دین کے معاملے میں کوئی جبر اور زور زبردستی نہیں ہے، اور ہر کسی کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے، ہدایت خدا کی عطا کردہ نعمت ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

لاَ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ . (2: 256)

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعاً اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ، وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلاَّ بِاَذْنِ اللهِ . (10: 99–100)

اگر تیرا رب چاہتا، تو روئے زمین پر بسنے والے سب لوگ ایمان لے آتے، کیا تم لوگوں کو اس بات پر مجبور کرو گے کہ وہ ایمان لے آئیں ؟ کوئی بھی شخص اللہ کے حکم ہی سے ایمان لاتا ہے۔

☆ انسان کی جان محترم ہے اور اسے ناحق زندگی سے محروم کرنا بہت بڑا جرم ہے، ایک انسان کا قتل سارے انسانوں کے قتل کے برابر ہے، ہر شخص کو اپنے نفس کی حفاظت کا حق حاصل ہے۔

وَلاَ تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللهُ اِلاَّ بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا . (33:17)

اور کسی نفس کو نہ مارڈالو جس کے ناحق مارنے کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اور جو کوئی ظلم سے مارڈالا گیا تو ہم نے اس کے وارث کو بدلہ کا حق دیا ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ اَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا . (32:5)

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی جان کو مارڈالے تو گویا اس نے سارے انسانوں کو مار دیا سوائے اس کے کہ مقتول نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو، اور جس نے ایک جان کی حفاظت کی تو گویا اس نے ساری انسانیت کی حفاظت کی۔

☆ ہر شخص کو اپنی املاک کے تحفظ کا حق حاصل ہے اور اس پر دست درازی کرنے والے کے لیے سخت سزا مقرر ہے، البتہ سزا دینے کا حق صرف حاکم کو ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللهِ . (38:5)

چور مرد ہو یا عورت اس کے ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ اس کے کرتوت کا بدلہ ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور تنبیہ۔

''ایک حدیث میں ہے کہ جو کوئی اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے'' من قتل دون ماله فهو شهيد۔ (ترمذی: 1418)

☆ ہر شخص کو عصمت و آبرو کی حفاظت کا حق حاصل ہے، کوئی بھی چیز جس سے کسی کی عصمت پر حرف آتا ہو خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو، قرآن اس سے منع کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ . (49:11)

اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی بعض عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور نہ لوگوں کو غلط ناموں سے پکارو۔

اسی طرح پاکباز عورتوں پر الزام تراشی کرنے والوں کو دنیا وآخرت میں دردناک عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ . (24:33)

جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاکباز اور بے خبر مومن عورتوں پر ان پر دنیا وآخرت میں لعنت ہے اور دردناک عذاب ہے۔

☆ ہر شخص کی نجی زندگی کو تحفظ حاصل ہے اور اس میں کوئی دخل اندازی درست نہیں ہے، خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے ہو، کسی کی جاسوسی کرنا، اس کے معاملات کی کھوج کرنا یا اس کے گھر میں بلا اجازت داخل ہو جانا، نجی زندگی کے تحفظ کے حق کو پامال کرنا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا . (49:12)

اے ایمان والو! بہت زیادہ ظن وگمان سے بچو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا . (24: 27)

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک نہ جاؤ جب تک اس گھر والوں کو تمہارے آنے کی اطلاع نہ ہو جائے اور تم انھیں سلام نہ کرلو۔

☆ مظلوم کو احتجاج کا حق حاصل ہے۔

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ . (4 : 148)

اللہ تعالیٰ بری بات کے اعلان کو پسند نہیں کرتا، البتہ اگر کسی پر ظلم ہوا ہو تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔

☆ اسلامی نظام سلطنت شورائیت پر مبنی ہے، جس میں ہر کام اہل رائے کے مشورہ سے انجام پاتا ہے، اس نظام میں امیر کا انتخاب اور اس جیسے دوسرے اہم اُمور مشورہ اور رائے عامہ کے ذریعہ عمل میں آتے ہیں، یہ نظام موجودہ جمہوریت سے بہت قریب اور اس کی جملہ خرابیوں سے محفوظ ہے، اس نظام میں خدا کے قوانین کو اس دنیا میں نافذ کرنے کے لیے ایک امیر کا انتخاب عمل میں آتا ہے، جس کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ . (4: 59)

اے ایمان والو! اللہ، اس کے رسول اور اپنے بااختیار لوگوں کی اطاعت کرو۔

☆ یہ امیر تمام فیصلے خدا کے قوانین کی روشنی میں اہل رائے کے مشورے سے کرتا ہے اور من مانی نہیں کرتا۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ . اور معاملات کے سلسلہ میں ان کا طریقہ کار آپسی مشورہ کا ہے۔

☆ ہر شہری کو حصول انصاف کا حق حاصل ہے اور کسی سے دشمنی انصاف کی راہ میں آڑے نہیں آنی چاہئے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لله شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا . (8:5)

اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کو اٹھ کھڑے ہو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل کی روش نہ چھوڑو، عدل و انصاف سے کام لو۔

اِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ .(90:16) بے شک اللہ تعالی عدل وانصاف کا حکم دیتا ہے۔

☆ جو لوگ اپنے حقوق کی حفاظت خود بہتر طور پر نہیں کر سکتے، قرآن ایسے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے معاشرے کو ابھارتا ہے اور انھیں ان کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین کرتا ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتَامٰى اَمْوَالَهُمْ ، وَلا تَتَبَدَّلُوْا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ إِلٰى اَمْوَالِكُمْ ، اِنَّهُ كَانَ حُوْباً كَبِيْراً . (2:4)

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور ان کے اچھے مال کو اپنے خراب مال سے نہ بدلو، اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت گناہ کی بات ہے۔

☆ حاکم اعلیٰ خدا کی ذات ہے، اسی کے بنائے ہوئے قوانین اس دنیا میں نافذ ہوں گے۔

قُلْ اَطِيْعُوْا اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللهَ لا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ . (32:3)

کہہ دو کہ اللہ کی اور رسول کی پیروی کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ نافرمانوں کو پسند نہیں کرتا۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللهَ . (59:4) اے ایمان والو! اللہ کی پیروی کرو۔

☆ لوگوں کے درمیان تنازع کی صورت میں فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق اور اس کے نازل کردہ دستور و قوانین کی روشنی میں کیا جائے گا۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللهُ وَلا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَ كَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً . (48:5)

ان کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے (قوانین) کے مطابق فیصلہ کرو اور اپنے پاس آئے ہوئے حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی اتباع نہ کرو، ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک دستور اور راہ عطا کی ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلا تَتَّبِعِ الْهَوىٰ . (26:38)

لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشات کے پیچھے نہ چلو۔

☆ خدا کے نازل کردہ حکم و قوانین کے مطابق کیے گئے فیصلہ کو جو لوگ تسلیم نہ کریں اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم، فاسق اور نافرمان ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللهُ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ . (44:5)

جو لوگ خدا کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی حقیقتاً کافر ہیں۔

☆ ایسے ہی لوگوں کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہے :

أُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ . (45:5) وہی ظالم لوگ ہیں۔

أُوْلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ . (47:5) وہی حقیقتاً نافرمان ہیں۔

☆ قرآن نے لوگوں کی جان، مال، عزت وآبرو اور عقل کی حفاظت کے لیے قتل، چوری، ڈاکہ زنی، زنا اور شراب نوشی جیسے جرائم کو حرام قرار دیا ہے اور ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزائیں متعین کی ہیں، جنھیں حدود کہا جاتا ہے۔

☆ قرآن نے کسی کی جان لینے کو حرام قرار دیا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ . (6: 152)

اس جان کو زندگی سے ناحق محروم نہ کرو، جسے مارنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

☆ جو قتل جان بوجھ کر کیا جائے اس کی وجہ سے سزا کے طور پر قصاص واجب ہوتا ہے، البتہ اگر مقتول کے ورثا دیت لینے پر آمادہ ہو جائیں، تو دیت واجب ہوتی ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْئٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ . (2: 178)

اے ایمان والو! مقتولین کے معاملہ میں تم پر قصاص واجب ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے، تو چاہیے کہ دستور کے مطابق عمل کرے اور بھلے طریقہ سے اسے ادا کردے۔

☆ یہ قصاص کی سزا یعنی جان کے بدلے جان لینا کوئی ظلم وتعدی نہیں، بلکہ قرآن کے الفاظ میں اسی سزا میں بنی نوع انسانی کی حیات مضمر ہے، کیوں کہ یہی سزا معاشرے میں قتل کے جرم کو عام ہونے سے روک سکتی ہے اور قاتلوں کو لگام دے سکتی ہے۔

وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیَاۃٌ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ . (2: 179)

اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے، تاکہ تم بچے رہو۔

☆ جو قتل بے قصد وارادہ ہو جائے اور اس میں قاتل کے منشا کا دخل نہ ہو، وہ قتل خطا کہلاتا ہے، اس کی سزا کے طور پر کفارہ واجب ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ دیت بھی واجب ہوتی ہے۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِناً اِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِناً خَطَأً فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُؤْمِنَۃٍ وَدِیَۃٌ مُسَلَّمَۃٌ اِلٰی اَھْلِہٖ اِلَّا اَنْ یَّصَّدَّقُوْا . (92:4)

کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو مار ڈالے مگر غلطی سے، اور جس نے کسی مومن کو غلطی سے مار ڈالا تو بدلے میں ایک مسلمان غلام آزاد کرنا اور مقتول کے گھر والوں کو دیت ادا کرنا ہوگا، البتہ اگر وہ معاف کردیں (تو کوئی بات نہیں)۔

☆ انسان کی عقل کی حفاظت کے لیے قرآن نے شراب نوشی کو حرام قرار دیا ہے اور اس سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ ، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ . (90:5)

اے ایمان والو! شراب، جوا، بُت اور پانسے شیطان کے گندے کام ہیں، تو ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہوسکو۔

☆ شراب نوشی کی ممانعت کا سبب بتاتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَفْعِھِمَا . (219:2)

وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ ان میں بہت زیادہ گناہ ہے اور لوگوں کا کچھ فائدہ بھی ہے، لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

☆ شراب کے ان نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ . (91:5)

شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ونفرت پیدا کردے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔

☆ زنا ایک گھناؤنا جرم ہے۔

وَلاَ تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلاً . (32:17)

زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بے حیائی کا کام اور برا راستہ ہے۔

اس کی سزا شادی شدہ کے لیے یہ ہے کہ اسے پتھروں سے مار کر ہلاک کردیا جائے اور غیر شادی شدہ لوگوں کو سو کوڑے لگائے جائیں۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ . (2:24)

زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔

☆ مال کے تحفظ کے لیے چوری کو بڑا جرم قرار دیا گیا ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا جَزَآءً بِمَا کَسَبَا نَکَالاً مِّنَ اللّٰہِ . (5: 38)

چور مرد ہو یا عورت اس کے ہاتھ کاٹ دو اس کے کرتوت کے بدلے، اللہ کی جانب سے بطور تنبیہ۔

☆ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرنے والوں، ڈاکہ زنی اور روئے زمین پر فساد برپا کرنے والوں کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کردیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں یا انھیں ملک بدر کردیا جائے، گویا جس درجے کا جرم ہو اس کے مطابق انھیں سزا دی جائے، البتہ اگر وہ توبہ کرلیں تو انھیں معاف کردیا جائے۔

إِنَّمَا جَزَاؤُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الْأَرْضِ فَسَاداً اَنْ يُّقَتَّلُوْا اَوْيُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذَالِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِی الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ، اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ . (5: 33–34)

ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یہ ہے کہ انھیں قتل کردیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں (مقابل کے) کاٹ دیے جائیں یا انھیں ملک بدر کردیا جائے، یہی دنیا میں ان کے لئے رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے، سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے تمہارے ہاتھ آنے سے پہلے ہی توبہ کرلی ہو۔

☆ کسی غیر یقینی خبر کی جب تک تصدیق نہ ہوجائے، اس وقت تک اس کے ردعمل میں کوئی اقدام کرنا درست نہیں، بلکہ پہلے اس کی تحقیق کرلینی ضروری ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَافَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ .

(6:49)

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو کہ کہیں تم نادانی میں کسی قوم پر جا پڑو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر شرمندہ ہونا پڑے۔

6.6 قرآن مجید اور بین قومی تعلقات

☆ قرآن امن کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔

لاَ تُفْسِدُوْا فِیْ الْاَرْضَ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا . (7: 85) زمین میں امن قائم ہونے کے بعد اس میں فساد نہ مچاؤ۔

قریش مکہ کو یہ نعمت خاص طور سے یاد دلاتا ہے کہ خدا نے انھیں امن جیسی دولت سے نوازا۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ، الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ . (106: 3–5)

تو انھیں چاہیے کہ رب کعبہ کی پیروی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور حالت خوف میں امن عطا کیا۔

قرآن کی نظر میں امن کی اہمیت کا اندازہ اس آیت سے بھی ہوتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِیْ الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا .

(32:5)

جس نے کسی نفس کو مار ڈالا تو گویا اس نے سارے انسانوں کو مار دیا، سوائے اس کے کہ مقتول نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو، اور جس نے کسی ایک نفس کی حفاظت کی تو گویا اس نے ساری انسانیت کی حفاظت کی۔

☆ عہد و میثاق کی بڑی اہمیت ہے اور معاہدہ کے بعد عہد کو پورا کرنا ضروری ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللهِ اِذَا عَاهَدْتُمْ وَلاَ تَنْقُضُوْا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللهُ عَلَيْكُمْ كَفِيْلاً . (91:16)

جب تم آپس میں معاہدہ کرو تو اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرو اور قسمیں پختہ کر لینے کے بعد نہ توڑو جب کہ تم اللہ کو اپنا ضامن بنا چکے ہو۔

☆ جو لوگ اپنا عہد پورا کریں اور کسی قسم کی عہد شکنی نہ کریں، ان سے کیے گئے عہد کو پورا کرنا ضروری ہے اور جب تک عہد کی مدت ختم نہ ہو جائے یا دوسرا فریق عہد کی خلاف ورزی نہ کرے، عہد شکنی کرنا جائز نہیں۔

اِلاَّ الَّذِيْنَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَداً فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ . (4:9)

مگر جن مشرکوں سے تمہارا معاہدہ ہے، پھر انھوں نے تمہارے ساتھ کچھ قصور نہ کیا اور نہ ہی تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی، تو ان کا عہد مدت پوری ہونے تک نبھاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ عہد کی پاسداری کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

☆ اگر مسلمان غیر مسلموں کے مقابلہ میں مدد چاہیں تو ان کی مدد کی جائے گی، لیکن اگر وہ ایسے ملک کے خلاف مدد چاہیں، جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، تو ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِیْ الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلاَّ عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ . (72:8)

اور اگر وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد چاہیں تو تمہیں ان کی مدد کرنی ہے، البتہ جب وہ ایسی قوم کے خلاف مدد چاہیں، جن سے تمہارا

معاہدہ ہے، تو مدد کرنا درست نہیں۔

☆ اگر دشمن بھی ان لوگوں سے مل جائیں جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے، تو ان سے بھی جنگ نہیں کی جائے گی۔

اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِیْثَاقٌ . (90:4)

سوائے ان لوگوں کے جو ان لوگوں سے مل جائیں جن سے تمہارا معاہدہ ہے۔

☆ عہد صرف اسی صورت میں توڑا جا سکتا ہے، جب دوسرا فریق عہد کی خلاف ورزی کرے اور عہد کو توڑ ڈالے، ایسی صورت میں معاہدہ ختم کر دینا درست ہے۔

وَاِنْ نَکَثُوْا اَیْمَانَھُمْ مِنْ بَعْدِ عَھْدِھِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ اِنَّھُمْ لَا اَیْمَانَ لَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ . (12:9)

اور اگر وہ عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں عیب لگائیں تو ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو، ان کی قسموں کی کوئی حیثیت نہیں، شاید کہ وہ باز آ جائیں۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ . (8: 58)

اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو یکساں طور پر ان کا عہد ان پر دے مارو، اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

☆ جو لوگ بار بار عہد شکنی کریں ان کے خلاف جنگ کی جائے گی اور بار بار عہد کی خلاف ورزی کا مزہ چکھایا جائے گا، تاکہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز آ جائیں۔

اَلَّذِیْنَ عَاھَدْتَ مِنْھُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ وَھُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ، فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَّنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ . (8: 56–57)

جن سے آپ نے عہد و پیمان کر لیا، پھر بھی وہ اپنے عہد و پیمان کو ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں اور بالکل پاسداری نہیں کرتے تو جب بھی آپ ان پر لڑائی میں غالب آ جائیں تو انھیں ایسی مار ماریں کہ ان کے پچھلے بھی بھاگ کھڑے ہوں تاکہ وہ عبرت حاصل کریں۔

☆ قرآن مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدمی دکھانے اور سرحدوں کی حفاظت کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا . (4: 200)

اے ایمان والو! ثابت قدم رہو، مقابلے میں مضبوطی دکھاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کرو۔

☆ اسلام امن کو پسند کرتا ہے اور کسی صورت فساد کو پنپتے نہیں دیکھ سکتا، امن کو برقرار رکھنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ کوئی طاقت ہو جو ان لوگوں کا ہاتھ روک سکے جو معاشرے میں بدامنی پھیلانے کے درپے ہوں، چنانچہ اسی طاقت کے استعمال کے لیے اسلام مظلوموں کو اجازت دیتا ہے کہ ظالموں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں، وہ اپنے ماننے والوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ ظالموں اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کے خلاف متحد ہو جائیں اور انھیں بزورِ قوت ان حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کریں، ظلم و جبر کے خلاف اسی کوشش اور جدوجہد کا نام جہاد ہے، قرآن کے الفاظ میں:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ ، الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَ صَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ

كَثِيْراً . (22: 39–40)

ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے لوگ اس وجہ سے لڑتے ہیں کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، وہ جن کو ان کے گھروں سے ناحق نکال باہر کیا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں بعض کو بعض سے ہٹایا نہ کرتا تو بہت سارے گرجا، کنیسے، عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دیئے جاتے، جن میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ اسی مقصد سے مسلمانوں پر جہاد فرض قرار دیا گیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ . (2: 216)

تم پر جہاد فرض قرار دیا گیا ہے، جب کہ یہ تمہیں ناگوار گزرتا ہے، ممکن ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو جب کہ وہی تمہارے لئے بہتر ہو۔

☆ قرآن یہ تصور دیتا ہے کہ بذاتِ خود قتال کوئی پسندیدہ اور اچھی چیز نہیں، لیکن وہ فتنہ جسے ختم کرنے کے لیے قتال کا حکم ہوا ہے، قتال سے کہیں بڑھ کر سنگین ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ . (2:217) اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے۔

چنانچہ اسی فتنہ کو ختم کرنا جہاد کا اصل مقصد ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ . (2:193)

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور پورا حکم اللہ کا ہو جائے، اگر وہ باز آ جائیں تو کوئی دشمنی نہیں ہے سوائے ظالموں کے۔

وہ ''فتنہ'' جسے ختم کرنے کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، اس کوشش کا نام ہے جو مسلمانوں کو زبردستی ان کے دین سے پھیرنے کے لیے کی جاتی ہے اور بزورِ قوت باز و ظلم کے ذریعہ انھیں دین پر عمل کرنے سے روکا جاتا ہے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا . (2: 217)

اور اگر ان کا بس چلے تو وہ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ تمہیں اپنے دین سے پھیر دیں۔

☆ ظلم سے روکنے اور فتنہ کو ختم کرنے کے لیے اسلام اپنے ماننے والوں کو ظالموں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ . (60:8)

اور جس قدر ممکن ہو سکے، ان سے مقابلے کے لئے قوت پیدا کرو اور گھوڑے تیار کرو، جس سے کہ اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر رعب پڑے اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی۔

☆ قرآن دورانِ جنگ صلح کی پیشکش قبول کر لینے کی ہدایت دیتا ہے، اگر دشمن صلح کی پیشکش کرے تو پھر ان سے جنگ درست نہیں۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلاً . (90:4)

اگر وہ تم سے الگ ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمہیں صلح کی پیشکش کریں، تو پھر اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف لڑنے کی کوئی راہ نہیں کھولی۔

☆ اگر دشمنوں کی طرف سے صلح کی پیشکش کو قبول کرنے میں کسی خطرہ کا اندیشہ ہو تو بھی خطرہ مول لے کر، اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے، اسے قبول کیا جائے گا اور صلح کر لی جائے گی۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ . (8: 61)

اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تم بھی جھک پڑو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

☆ جنگی قیدیوں کو یا تو بلا فدیہ لیے چھوڑ دیا جائے گا، یا ان سے فدیہ لے کر انھیں رہا کیا جائے گا۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً . (4:47)

پھر بعد میں یا تو احسان کرتے ہوئے یا فدیہ لے کر (انھیں رہا کیا جائے گا)۔

☆ جنگی قیدی جب تک قید میں رہیں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا، قرآن ایسے لوگوں کی تعریف کرتا ہے، جو ان سے حسن سلوک کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا . (8:76)

اور وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

☆ وہ مال جو کافروں سے جنگ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، مالِ غنیمت کہلاتا ہے، اس کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ اس کے کل پانچ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ، آپ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا اور بقیہ چار حصے لشکر میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ . (41:8)

اور جان لو کہ جو کچھ بھی تم مالِ غنیمت حاصل کرو، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول ﷺ، رسول ﷺ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

☆ جو مال کافروں سے بغیر جنگ کیے ہوئے حاصل ہو جاتا ہے وہ فَیٔ کہلاتا ہے، یہ مال پورا کا پورا اللہ کے رسول ﷺ، آپ ﷺ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اسے لشکر میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ . (59: 7)

اور جو اللہ نے کافروں سے اپنے رسول کے ہاتھ لگایا، تم نے نہ تو اس پر گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہے غلبہ عطا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے، جو کچھ اللہ بستی والوں سے اپنے رسول کے ہاتھ لگائے تو وہ اللہ، اس کے رسول ﷺ، رسول کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

☆ اسلامی سلطنت اپنے تمام شہریوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے، غیر مسلموں کی حفاظت کی غرض سے اسلامی سلطنت ان سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے وہ جزیہ کہلاتا ہے، قرآن نے جزیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے، بلکہ یہ وقت اور حالات کے مطابق لیا جاتا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ . (9: 29)

ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور سچا دین قبول نہیں کرتے ، ان لوگوں میں جو اہل کتاب ہیں، یہاں تک کہ وہ اقتدار سے دستبردار ہو کر اور بے قدر ہو کر جزیہ ادا کریں۔

6.7 قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات

6.7.1 اچھے اخلاق

☆ قرآن سچائی اور راست بازی کی تعلیم دیتا ہے اور اسے بڑے وسیع معنی میں استعمال کرتا ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْن آمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ . (119:9)

اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

☆ قرآن جن لوگوں کو خدا کی مغفرت اور اجر عظیم کی خوشخبری سناتا ہے، ان میں اسلام و ایمان اور خدا کی فرماں برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے۔

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ -- اَعَدَّ اللهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيْماً . (35: 33)

اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرماں بردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں--- خدا نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر رکھا ہے۔

☆ قرآن کی ایک اہم اخلاقی تعلیم سخاوت ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ . (3:2)

اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْن آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَاتِىَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلاَ خُلَّةٌ وَلاَ شَفَاعَةٌ . (254:2)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اس میں سے کچھ خرچ کو، جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہے، نہ دوستی اور نہ کوئی سفارش۔

قرآن اس سخاوت و فیاضی کو قرض قرار دیتا ہے جو بندہ اپنے خدا کو دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے یہ قرض کئی گنا واپس کرے گا۔

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَناً فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ اَجْرٌ كَرِيْمٌ . (11: 57)

کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے تو وہ اس کو اس کے لیے دوگنا کر دے، اور اس کے لیے باعزت بدلہ ہے۔

وہ خوشحالی اور تنگی ہر حال میں خرچ کرنے والوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَ ةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ. (3 : 134)

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کی وسعت آسمان و زمین کو محیط ہے اور جو ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں۔

☆ قرآن خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور احسان جتانے کو ناپسند کرتا ہے۔

وَمَا تُنفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ . (2 :271)

اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی رضا کے لیے۔

☆ قرآن وہی چیز خرچ کرنے اور دوسروں کو دینے کی ہدایت دیتا ہے جو خود اپنے لیے بھی ناپسندیدہ نہ ہو، اور بہترین چیزیں خرچ کرنے کو پسند کرتا ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوْا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيْهِ . (2: 267)

اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو زمین سے ہم نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے، اس میں سے اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے بری چیز دینے کا ارادہ نہ کرو، کہ تم دیتے تو ہو، جب کہ تم اس کو لینے والے نہیں۔

☆ عفت و پاکبازی ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، چنانچہ قرآن مومنوں کے امتیازی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُوْلَٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ . (23 :5)

(کامیاب ہوگئے وہ لوگ) جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا اپنی باندیوں سے، تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس سے تجاوز کریں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلنے والے ہیں۔

☆ اسی غرض سے قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰالِكَ اَزْكٰى لَهُمْ. (24:30)

مومنوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے پاکیزگی کی راہ ہے۔

اسی طرح عورتوں کو بھی ان تمام چیزوں سے روک دیا گیا، جس سے مردوں کو شہ ملے، چنانچہ انھیں درج ذیل ہدایات دی گئیں :

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ . (24:31)

اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نظریں جھکائے رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنا سنگار ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اس کے جو ظاہر ہو جائے اور وہ اپنی چادریں اپنے گریبانوں پر ڈال لیں۔

☆ لین دین کے معاملات میں دیانت داری اور امانت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، قرآن اس اہم اخلاقی صفت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے حاملین کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ . (23:8)

اور جو لوگ اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس حکم کی منادی کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوْا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا . (4: 57)

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کردیا کرو۔

☆ شرم وحیا انسان کا فطری وصف ہے جس سے بہت سی اخلاقی خوبیاں پروان چڑھتی ہیں اور انسان اس کے ذریعہ بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے، قرآن نبی کریمﷺ کے بارے میں کہتا ہے :

اِنَّ ذٰالِکُمْ کَانَ یُوْذِیْ النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنکُمْ . (33 : 53)

اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے۔

قرآن حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکیوں کا ذکر مدح وستائش کے ساتھ کرتا ہے :

فَجَآءَ تْہُ اِحدَا ھُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَاءٍ . (28 :25)

ان میں سے ایک لڑکی ان کے پاس شرماتی ہوئی آئی۔

نبی کریمﷺ کا ارشاد ہے:''الحیاء لا یأتی إلا بخیر ''یعنی حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے، دوسری جگہ فرمایا:''ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولی اذا لم تستحی فاصنع ماشئت ''یعنی لوگوں نے پرانے پیغمبروں سے جو باتیں پائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم وحیا نہیں ہے تو جو چاہو کرو۔

☆ قرآن عدل وانصاف کے قیام پر زور دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اس کا حکم دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ . (16 :90)

بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وہ اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ کسی سے دشمنی عدل وانصاف کی راہ میں نہ آنے پائے اور انسان عدل کو چھوڑ نہ بیٹھے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْن آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَانُ قَوْمٍ عَلٰی أَنْ لَا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی. (8:5)

اے ایمان والو! خدا کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے تیار رہو اور لوگوں کی عداوت کی وجہ سے کہیں تم یہ جرم نہ کر بیٹھو کہ انصاف نہ کرو، ہر حال میں انصاف کرو کہ یہ پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

قرآن فیصلہ میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتے ہوئے کہتا ہے۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ . (58:4)

اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

☆ بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی اخلاقی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں، اسے پورا کریں اور جو قول وقرار کریں، اس کے پابند رہیں، چنانچہ قرآن ایسے لوگوں کو کامیابی کی بشارت سناتا ہے، جو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔

اَلْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْا . (177:2)

اور جب بھی عہد کریں تو اپنے عہد کو نبھانے والے۔

دوسری جگہ انھیں جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمَانَاتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ . (70 :32)

وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

☆ دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور بھلائی کرنا ایک عظیم اخلاقی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، اس کی بہت ساری صورتیں ہیں، قرآن تمام معاملات میں احسان یعنی دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ . (90:16)

اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ انصاف اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ إِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ . (237:2)

آپس میں فضل (بھلائی) کو مت بھولو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

☆ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے والے خدا کے محبوب بندے ہیں۔

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ . (148: 3)

☆ قرآن کافر و مسلم سب کے ساتھ بھلائی اور اچھے سلوک کا حکم دیتا ہے، چنانچہ کافروں کے متعلق کہتا ہے:

لَا یَنۡہَاکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡھُمۡ وَتُقۡسِطُوۡا اِلَیۡھِمۡ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ . (8:60)

جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا، اللہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

☆ نیکی کا بدلہ بھی نیکی ہی ہے۔

ھَلۡ جَزَاءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ . (60:55)

بھلائی کا بدلہ تو صرف بھلائی ہی ہے۔

☆ عفو و درگزر ایک عظیم اخلاقی صفت ہے، خصوصاً غصہ کی حالت میں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا معاف کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مومنوں کی امتیازی صفت بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ جب وہ غصہ ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں:

وَ إِذَا مَا غَضِبُوۡا ھُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ . (37:42)

قرآن اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ اگر بندہ کسی کے قصور کو معاف کر دیتا ہے تو خدا بھی اس کے قصوروں سے درگزر کرتا ہے۔

وَلۡیَعۡفُوۡا وَلۡیَصۡفَحُوۡا اَلَا تُحِبُّوۡنَ أَنۡ یَغۡفِرَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ . (22:24)

اور چاہیے کہ وہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے، اور اللہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔

قرآن اس موقع پر بھی عفو و درگذر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے، جب مخالف جماعتیں حق کی راہ میں روڑے اٹکائیں اور اپنے بغض و حسد کا مظاہرہ کریں :

خُذِ الۡعَفۡوَ وَأۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجَاھِلِیۡنَ . (199:7)

عفو و درگزر سے کام لو اور نیک کاموں کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

قرآن معاف کر دینے کو بڑی ہمت کا کام بتاتا ہے اور اسے عظیم اخلاقی صفت کے طور پر پیش کرتا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ . (43:42)

اور جو شخص صبر کرے اور دوسرے کو بخش دے، تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

☆ قرآن رفق ولطف اور معاملات میں نرمی برتنے کو ایک اخلاقی صفت کے طور پر پیش کرتا ہے، وہ اسے انبیا کی صفت بتاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے :

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ . (114:9)

بے شک ابراہیم علیہ السلام نیک دل بُردبار تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں بھیجتے وقت جو ہدایت دی گئی اس کا ذکر قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى . (44: 20)

اور اس سے نرم لہجہ میں بات کرو تا کہ وہ نصیحت حاصل کرے اور ڈرے۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ صفت ایک عظیم نعمت کے طور پر عطا کی گئی تھی، جس کا تذکرہ قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ . (159:3)

اللہ کی رحمت سے تم ان کے لیے نرم دل ہو گئے، اگر تم تیز مزاج اور سخت گیر ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔

☆ قرآن بندوں کو تواضع وخاکساری اور عاجزی کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ خود نبی ﷺ کو مومنوں سے محبت اور تواضع کی ہدایت دی گئی۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ . (215:26)

اور جو تیرے پیروکار ایمان والے ہیں، ان سے محبت اور عاجزی سے پیش آؤ۔

اور خدا اپنے خاص بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا . (63:25)

اور خدا کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

قرآن حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ، وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ . (18:31)

اور لوگوں سے بے رُخی نہ برتو اور زمین پر اترا کر نہ چلو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی خور کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز نیچی رکھو۔

☆ قرآن ایثار کی تعلیم دیتا ہے اور ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو ایثار کرتے ہوئے اپنی ضرورتوں پر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو آرام فراہم کرتے ہیں۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ . (9: 59)

اور جو دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ وہ خود تنگی میں کیوں نہ ہوں، اور جو اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے، تو ایسے ہی لوگ

کامیاب ہونے والے ہیں۔

☆ خودداری اورعزت نفس وہ اخلاقی وصف ہے، جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے، چنانچہ قرآن مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کو ان کے بلند مقام کی یاددہانی کراتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ . (110: 3)

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہو۔

☆ قرآن ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے، جو فقر و فاقہ کی حالت میں ہونے کے باجود اپنی خودداری اور عزت نفس پر آنچ نہیں آنے دیتے اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْباً فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً . (273: 2)

(صدقات) ان حاجت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، علاقہ میں کہیں جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری کی وجہ سے انھیں غنی سمجھتا ہے، تم ان کو ان کے اوصاف سے پہچان لوگے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

☆ قرآن حق گوئی کی تعلیم دیتا ہے، یہ اخلاقی وصف حق و باطل کی کشمکش میں نکھر کر سامنے آتا ہے کہ اس وقت برملا حق کا اظہار کیا جائے اور حق کی حمایت میں آواز بلند کی جائے، قرآن نبی کریم ﷺ کو اس کی ہدایت دیتے ہوئے کہتا ہے :

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ . (94:49)

تم کو جو حکم دیا گیا ہے، اسے کھول کر سنادو اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو۔

حق گوئی کی راہ میں کسی ملامت کی پروانہ کرنے کو مسلمانوں کا ایک ممتاز اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے۔

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ . (54:5)

اور لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

☆ قرآن کی ایک اخلاقی تعلیم استغنا یعنی بے نیازی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی ذات کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور اسے جو کچھ بھی ملا ہے، اس پر مطمئن رہے، قرآن کے الفاظ میں:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ . (32:4)

اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے، اس کی ہوس مت کرو۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجاً مِّنْهُمْ . (131: 20)

اور اپنی آنکھیں نہ پھیلاؤ اس طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

6.7.2 برے اخلاق

بعض برے اخلاق جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ان سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، یہ وہ اخلاقی خرابیاں ہیں، جن کے باعث انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی، مادی اور معاشرتی نقصان پہنچتا ہے اور ہر عقل مند انسان انھیں فطرتاً ناپسند کرتا ہے، قرآن عموماً ان اخلاقی خرابیوں کے لئے فحشا، منکر اور بغی کے الفاظ استعمال کرتا ہے، چند اخلاقی خرابیاں جن سے قرآن منع کرتا ہے، درج ذیل ہیں :

☆ جھوٹ ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے، چنانچہ قرآن نے جھوٹ بولنے والوں کے لیے خطرناک وعید سنائی ہے۔

اِنَّ اللہَ لاَ یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ . (39 :3)

بے شک اللہ تعالیٰ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور احسان فراموش ہے۔

جھوٹا شخص خدا کی لعنت کا مستحق قرار پاتا ہے۔

اَنَّ لَعْنَۃَ اللہِ عَلَیْہِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ . (24 :7)

اور اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو، تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

☆ قرآن خیانت اور بددیانتی سے سختی سے منع کرتا ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَخُوْنُوْا اللہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمَانَاتِکُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . (27:8)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور اپنی آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

قرآن اس بات سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ظاہری ہی نہیں، بلکہ باطنی خیانتوں سے بھی واقف ہے۔

یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِیْ الصُّدُوْرِ . (19:40)

اللہ آنکھوں کی خیانت سے واقف ہے اور جو کچھ سینوں میں چھپا ہے اس سے بھی۔

☆ بہتان تراشی ایک اخلاقی جرم ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ منسوب کر دیا جائے، قرآن نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔

وَمَنْ یَکْسِبْ خَطِیْئَۃً أَوْ إِثْماً ثُمَّ یَرْمِ بِہِ بَرِیْئاً فَقَدِ احْتَمَلَ بُھْتَاناً وَإِثْماً مُبِیْناً. (112:4)

اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھر دے، تو اس نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُھْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِیْناً . (58:33)

اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ان گناہوں کی تہمت لگا کر تکلیف پہنچاتے ہیں، جو انھوں نے نہیں کیے ہیں، تو انھوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا۔

☆ قرآن چغل خوری کو عیب قرار دیتا ہے، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی کہ ایسے لوگوں کی بات نہ مانی جائے۔

وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّھِیْنٍ ھَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِیْمٍ . (11:68)

آپ ایسے لوگوں کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھاتے ہیں، آبرو باختہ ہیں، آوازے کستے ہیں اور چغلیاں لگاتے پھرتے ہیں۔

خود نبی کریم انے ارشاد فرمایا: ''لا یدخل الجنۃ قتات '' (ابوداؤد: کتاب الأدب باب فی القتات) یعنی جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔

☆ قرآن غیبت اور بدگوئی سے بھی منع کرتا ہے اور اسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیتا ہے۔

وَلاَ یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضاً اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَأْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتاً فَکَرِھْتُمُوْہُ . (12:40)

اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے (یعنی اسے پیٹھ پیچھے برا بھلا نہ کہے)، بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تو اس سے تو تمہیں گھن آئے گی۔

☆ قرآن دورخے پن کو بھی اخلاقی برائی قرار دیتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں منافق قرار دیتا ہے، وہ ان کے متعلق کہتا ہے:

وَإِذَا لَقُوْا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْ آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُ وْنَ . (14:2)

وہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔

☆ قرآن بدگمانی سے بھی منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بعض اوقات یہ بدگمانی گناہ کا سبب بنتی ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ .(12:49)

اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

☆ بخل بھی ایک اخلاقی برائی ہے اور بہت ساری برائیوں کا سبب بنتا ہے، قرآن جہنمیوں سے سوال و جواب کا ایک منظر پیش کرتے ہوئے بخل کی مذمت کرتا ہے، اور اسے جہنم رسید ہونے کا سبب بتاتا ہے :

مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ . (42:74)

(پوچھا جائے گا) تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی؟ کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

قرآن ایسے لوگوں کو وعید سناتے ہوئے کہتا ہے :

وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّلَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ . (180: 3)

اور جو لوگ اس مال کو، جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے، روکے رکھتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں، قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں پہنایا جائے گا۔

☆ قرآن رشوت کو اخلاقی جرم قرار دیتا ہے اور اس کی ہر صورت کی مذمت کرتا ہے :

وَلاَ تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقاً مِنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . (188:2)

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے جان بوجھ کر کھا جاؤ۔

اہل کتاب علما اپنی کتابوں میں مال و دولت کے بدلے جو تحریفات کیا کرتے تھے، ان کی مذمت قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهِ ثَمَناً قَلِيْلاً اُوْلٰئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ . (174:2)

وہ لوگ جو خدا کے ذریعہ نازل کردہ احکام کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے حقیر معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔

☆ دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کو پالنا بغض و کینہ کہلاتا ہے، قرآن اس کی مذمت کرتا ہے اور اہل ایمان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس سے

محفوظ رہنے کی دُعا مانگیں :

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ .
(10:59)

اے ہمارے رب! ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں، بخش دے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے کینہ کو جگہ نہ دے، اے رب تو بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

جنت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ وہاں بغض و کینہ کا گزر نہ ہوگا :

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ . (47:49)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا کہ اب بھائی ہو تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے۔

☆ قرآن ظلم کو حرام قرار دیتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ . (33:7)

کہہ دو کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق ظلم و سرکشی کو حرام قرار دیا ہے۔

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ . (90:16)

اور خدا بے حیائی کے کام، ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔

قرآن ظلم کرنے والوں کے خلاف لڑائی کا حکم دیتا ہے اور آخرت میں بھی انھیں دردناک عذاب کی وعید سناتا ہے :

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ . (42:42)

راہ ان لوگوں پر ہے جو ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰا هُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ. (9:49)

اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے گروہ سے سب مل کر جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔

☆ قرآن فخر و غرور اور تکبر کو ناپسند کرتا ہے اور اسے شیطان کی روش قرار دیتا ہے :

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِيْنَ. (7 :13)

یہاں سے اُتر جا یہاں تو غرور نہیں کر سکتا، نکل جا تو ذلیل اور حقیر ہے۔

قرآن متکبرین کا ٹھکانہ جہنم کو قرار دیتا ہے:

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ . (60:39)

کیا جہنم مغروروں کا ٹھکانہ نہیں ہے؟

قرآن غرور و تکبر کی ہر صورت کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے منع کرتا ہے :

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا . (18:31)

اور لوگوں سے بے رُخی نہ برتو اور زمین پر اترا کر نہ چلو۔

☆ قرآن ریا اور نمائش کو سخت ناپسند کرتا ہے، کہ یہ برائی انسان کے نیک اعمال کو بھی بے ثمر بنا دیتی ہے، چنانچہ مسلمانوں کو جہاد میں نکلتے وقت حکم دیا گیا کہ تمہارا مقصد محض حق کی حمایت ہو نہ کہ نمود و نمائش :

وَلاَ تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَراً وَرِئَاءَ النَّاسِ . (47:8)

اور ان کافروں جیسے نہ بنو جو شیخی کے مارے لوگوں کو دکھلانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

قرآن صدقات اور نماز کے سلسلے میں خصوصاً اس بات کی ہدایت دیتا ہے کہ اس میں نمائش کا کوئی پہلو داخل نہ ہونے پائے اور ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے، جو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے یہ کام انجام دیتے ہیں، وہ بتاتا ہے کہ جو لوگ نمود و نمائش کے لیے صدقات دیتے ہیں انھیں اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلاَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ . (264:2)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور سائل کو طعنہ دے کر ضائع مت کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

☆ حسد یعنی دوسرے کی نعمت کو پسند نہ کرنا اور خواہش کرنا کہ وہ اس سے چھن جائے ایک عظیم اخلاقی بیماری ہے، قرآن اسے یہود اور کفار و منافقین کی صفت قرار دیتا ہے :

وَدَّ كَثِيْرٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّاراً حَسَداً مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ . (109:2)

بہت سے اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر تم کو کافر بنا دیں۔

قرآن اپنے ماننے والوں کو نہایت بلند اخلاقی کی تعلیم دیتا ہے، وہ صرف حسد سے ہی منع نہیں کرتا، بلکہ دوسروں کو ملی نعمت کی خواہش کرنے سے بھی منع کرتا ہے :

وَلاَ تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ . (32:4)

اور خدا نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو برتری دے رکھی ہے اس کا ارمان نہ کرو۔

6.8 خلاصہ

قرآن کریم کے اندر دین کے حقائق اور اصول و قواعد کے علاوہ اخلاق و آداب کی تعلیم دی گئی ہے اور زندگی گذارنے کا پورا دستور العمل بتایا گیا ہے، یہاں درج اکائی میں معاشی تعلیمات کے اندر سود اور دھوکہ کو حرام بتا کر، مال کو گردش میں رکھنے اور نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ پھر معاشرتی تعلیمات کے تحت نکاح و طلاق کے احکام، پردہ کی اہمیت، نان نفقہ کے حقوق، والدین اور دوسرے کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ سیاسی تعلیمات میں بتایا گیا ہے دین میں زور زبردستی نہیں ہے، ناحق قتل حرام ہے، مال، آبرو اور عزت کو تحفظ حاصل ہے اور چوری و زنا جیسے سنگین جرائم پر سزا مقرر ہے۔ بین قومی تعلقات میں عدل و انصاف، امن عالم، مذہبی رواداری اور معاہدہ کی پاسداری جیسے امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اخلاقی تعلیمات میں صداقت و دیانت، حیا، صبر، عدل اور حکم پر آمادہ کرنے کے ساتھ جھوٹ، ظلم، کینہ و حسد، چغلی، بدگمانی، بخل، غرور اور بے حیائی کے کاموں سے روکا گیا ہے۔

6.9 نمونۂ امتحانی سوالات

مختصر جوابی سوالات:

1۔ قرض کے لین دین، سود اور غلط طریقہ سے کمائے گئے مال کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیمات پر روشنی ڈالئے۔

2۔ نکاح سے متعلق قرآنی تعلیمات پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجئے۔

3۔ قرآن مجید بین قومی تعلقات سے متعلق کیا تعلیمات فراہم کرتا ہے؟ تحریر کیجئے۔

4۔ اچھے اخلاق سے متعلق قرآنی تعلیمات پر روشنی ڈالئے۔

طویل جوابی سوالات:

1۔ قرآن مجید کی معاشی تعلیمات کا جائزہ لیجئے۔

2۔ قرآن مجید کی معاشرتی تعلیمات پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجئے۔

3۔ قرآن مجید کی سیاسی تعلیمات پر روشنی ڈالئے۔

4۔ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کیا ہیں؟ بیان کیجئے۔

6.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1۔ قرآنی تعلیمات : مولانا محمد یوسف اصلاحی

2۔ قرآن کیا کہتا ہے؟ : مولانا محمد منظور نعمانی

3۔ مضامین قرآن مجید (دو جلدیں) :

4۔ الفہرس الموضوعی لآیات القرآن الکریم :

-:oOo:-

اکائی 7 : تفسیر-معنیٰ اور مآخذ

اکائی کے اجزاء

7.1 مقصد

7.2 تمہید

7.3 ضرورت واہمیت

7.4 لغوی واصطلاحی معنی

7.5 تفسیر قرآن کے مآخذ

7.5.1 قرآن سے قرآن کی تفسیر

7.5.2 حدیث سے تفسیر

7.5.3 تفسیر اور آثارِ صحابہ

7.5.4 تفسیر اور عربی زبان ولغت

7.5.5 تفسیر اور عقل سلیم

7.5.6 اسرائیلی روایات

7.5.7 تفسیر بالرائ

7.6 خلاصہ

7.7 نمونۂ سوالات

7.8 فرہنگ

7.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

7.1 مقصد

اس اکائی کے ذریعہ طلبہ تفسیر قرآن مجید کے معانی ومفاہیم سے واقف ہوں گے، اس کی ضرورت واہمیت سے بھی آگاہی ہوگی، اس کے اُصول ومآخذ اور مختلف مناہج تفاسیر سے بھی واقفیت حاصل ہوگی۔

7.2 تمہید

اس اکائی میں یہ بات واضح کی جائیگی کہ تفسیر قرآن کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کی کیا اہمیت وفضیلت ہے؟ نیز تفسیر کے لغوی و اصطلاحی معنی پر روشنی ڈالتے ہوئے تفسیر وتاویل کا فرق واضح کیا جائے گا، پھر تفسیر قرآن مجید کے مآخذ---قرآن مجید، حدیث، آثار صحابہ، عربی زبان اور عقل وقیاس--- سے استفادہ کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا جائے گا، نیز تفسیر میں اسرائیلی روایات اور رائے کی حیثیت پر روشنی ڈالی جائیگی۔

7.3 ضرورت واہمیت

اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ قرآن مجید خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی آخری کتاب ہے، اور اللہ تعالی نے اعلان کر دیا ہے کہ یہ کتاب قیامت تک بے آمیز طریقہ پر محفوظ رہے گی، یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے، زبان وادب کے حسن کا ایک پہلو یہ ہے کہ بعض باتوں کو کھلے ہوئے الفاظ میں کہا جائے اور بعض باتیں استعارہ اور کنایہ کے پردہ میں ذکر کی جائیں، جیسے ہر لفظ کا مبہم ہونا ایک عیب ہے، اسی طرح ہر لفظ کا کنایہ وتشبیہ سے عاری ہونا بھی زبان کی خوبصورتی اور کشش کو مجروح کر دیتا ہے، نیز بعض دفعہ کلام میں ابہام سے اس کی معنویت دوبالا ہو جاتی ہے، یہ کچھ عربی زبان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر زبان کے ادب میں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں بھی جہاں ایسی آیات ہیں، جن کا مفہوم بالکل واضح ہے اور جن کو خود قرآن میں ''محکمات'' سے تعبیر کیا گیا ہے، وہیں ایسی آیات بھی ہیں، جن میں تشبیہ وتمثیل سے کام لیا گیا ہے، یا جن میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے اور یہ احتمال وابہام بھی معنوی اعتبار سے فائدہ سے خالی نہیں ہے، مثال کے طور پر قرآن نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے لباس سے تعبیر کیا ہے، لباس میں کئی خصوصیات ہیں:

- لباس انسان کے لئے زینت اور وقار کا سبب ہے۔
- لباس کے ذریعہ خارجی اثرات سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے۔
- لباس جسم کے عیوب کو ڈھانک دیتا ہے۔
- لباس انسان کے جسم کا سب سے قریبی رازدار ہوتا ہے۔
- لباس انسان کے وجود سے سب سے قریب تر شئے ہوتی ہے۔

اب غور کیجئے! کہ اس ایک تشبیہ میں ازدواجی رشتہ کے کتنے تقاضوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور پھر تعبیر کی خوبصورتی اور اہل ذوق کے لئے اس کا لطف الگ رہا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے وضو کے افعال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: ''**وامسحوا برؤسکم**'' (المائدۃ:٦) آیت کے اس ٹکڑے میں سر پر مسح کرنے کا حکم ہے، اس میں ''رؤس'' پر ''ب'' داخل ہے، ''ب'' کے معنی عربی میں ''بعض'' کے آتے ہیں اور بعض صورتوں میں یہ زائد بھی ہوتی ہے، جس کا مقصد دو کلمات کو باہم مربوط کرنا ہوتا ہے، اس کا کوئی مستقل اور علاحدہ معنی نہیں ہوتا، اگر ''ب'' پہلے معنی میں ہو تو مقصد ہوگا کہ سر کے کچھ حصہ کا مسح کرلو اور دوسری صورت میں پورے سر کا مسح مراد ہوگا، اب اس لفظ کی مناسب تشریح کے لئے لغت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے روشنی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

پس قرآن مجید کی کچھ آیات تو بالکل واضح ہیں کہ عربی زبان سے واقفیت ان کو سمجھنے کے لئے کافی ہے؛ لیکن قرآن کی بہت سی

تعبیرات میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال بھی ہے، ایسے کلمات اور فقروں کی تشریح وتوضیح کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی کے لئے علم تفسیر کی ضرورت پیش آئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن اللہ کی زمین پر اللہ کا دسترخوان ہے، اس سے جس قدر ہو سکے علم حاصل کرلو، (الترغیب والترہیب: ۳۵۴/۲، عن ابن مسعود)---اس سے معلوم ہوا کہ علم تفسیر گویا اللہ تعالیٰ کے دسترخوان سے فائدہ اُٹھانا ہے، ایک اور حدیث میں ہے کہ اہل قرآن اہل اللہ اور اللہ کے خاص بندے ہیں، علماء کے نزدیک یہاں ''اہل اللہ'' سے مراد مفسرین قرآن ہیں، اس سے علم تفسیر کی اہمیت وفضیلت معلوم ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی فن کی اہمیت تین پہلوؤں سے متعین ہوتی ہے، اس بات سے کہ اس کا موضوع کیا ہے؟ اس بات سے کہ اس علم کے حاصل کرنے کی غرض کیا ہے؟ اور اس بات سے کہ اس کی ضرورت کس درجہ ہے؟---علم تفسیر کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے کلام سے بڑھ کر فضیلت وشرف والی اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی،---فن تفسیر کا مقصود ہدایت حاصل کرنا ہے، جو انسان کے لئے دنیا وآخرت میں فلاح ونجات کی کلید ہے---اور ضرورت اس فن کی تمام علوم سے بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ عقیدہ ہو یا عبادت، معاشرت ہو یا معیشت، اخلاق ہو یا سیاسی واجتماعی مسائل اور بین قومی تعلقات، زندگی کے تمام ہی شعبوں میں قرآن مجید سے روشنی حاصل کرنا انسانیت کے لئے بہت بڑی ضرورت ہے؛ اس لئے اجر وثواب کے لحاظ سے بھی اور اپنے موضوع، غرض وغایت اور ضرورت کے اعتبار سے بھی تفسیر بہت ہی اہم فن ہے۔

7.4 لغوی واصطلاحی معنی

تفسیر کا مادہ ''ف، س، ر'' ہے، جس کے معنی واضح کرنے اور کھولنے کے ہیں، علم تفسیر سے معانی قرآن کی وضاحت ہوتی ہے، اسی لئے اسے ''تفسیر'' کہتے ہیں۔

تفسیر کی فنی تعریف کے سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں لکھی ہیں، لیکن ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے، اس سلسلہ میں علامہ بدر الدین زرکشی کی تعریف بہت واضح ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں :

''علم یفهم به کتاب الله المنزل علی نبیه محمد صلی الله علیه وسلم وبیان معانیه واستخراج احکامه وحکمه''۔

وہ علم جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب کو سمجھا جائے، اس کی مرادات کو واضح کیا جائے اور اس سے احکام اور حکمتوں کا استخراج کیا جائے۔

اس تعریف میں قرآن سے متعلق سارے علوم شامل ہیں، علم قرأت، اسباب نزول کا علم، مفردات القرآن کا علم، قرآن کی ترکیبی حیثیت کا علم، جو نحو وصرف اور معانی وبیان کے جاننے پر موقوف ہے اور قرآن سے احکام کا اخذ واستنباط اور اس کے قصص وواقعات اور آیاتِ منسوخہ سے آگہی؛ کیوں کہ ان سب کو جانے بغیر معانی قرآن کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

تفسیر سے قریب ایک اور لفظ ''تاویل'' ہے، ''اَوّل'' کے معنی رجوع کرنے کے ہیں، جب کسی کلام کی وضاحت کرنی ہوتی ہے تو الفاظ

کے راستہ سے معانی کی طرف رُجوع کیا جاتا ہے، اسی مناسبت سے تشریح قرآنی کے لئے تاویل کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اب اس میں اختلاف ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے تفسیر اور تاویل ایک ہی ہے یا دونوں میں کچھ فرق ہے؟ --- ابتدائی دور میں تو تفسیر اور تاویل کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد کے ادوار میں ان دونوں اصطلاحات کے درمیان تھوڑا سا فرق کیا جانے لگا، --- تفسیر و تاویل کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ اگر تشریح روایت کی بنیاد پر ہو تو تفسیر ہے اور اگر درایت یعنی فہم کی بنیاد پر ہو تو تاویل ہے، ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ عبارت سے جو مفہوم صراحتاً سمجھا جائے وہ تفسیر ہے اور جو بات اشارہ سے ثابت ہوتی ہو وہ تاویل ہے، اس طرح کے اور بھی اقوال ہیں، مگر اس سلسلہ میں زیادہ تر اہل علم کا رجحان امام ابو المنصور ماتُرِیدی کے قول کی طرف ہے کہ آیات کے متبادر معنی کو بیان کرنا اور واضح مفہوم کو نقل کرنا 'تفسیر' ہے اور آیت سے دلیل کی بنیاد پر ایسا معنی مراد لینا، جس کی طرف بلا تأمل ذہن کا تبادر نہ ہوتا ہو یا جس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو، ان میں سے ایک معنی کو متعین کرنا 'تاویل' ہے، ---- ویسے یہ محض تعبیری اختلاف ہے، قرآن کی تشریح و توضیح پر اس اختلاف کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

7.5 تفسیر قرآن کے مآخذ

قرآن مجید چوں کہ اللہ کا کلام ہے، اس لئے اس کی تشریح و توضیح میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے؛ اسی لئے وہ مآخذ متعین ہیں، جن کی مدد سے قرآن مجید کی تفسیر کی جاسکتی ہے، یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر ہر شخص کو اپنی رائے اور قیاس پر توضیحِ قرآن کا حق دے دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ اس سے قرآن مجید میں معنوی تحریف کا راستہ کھل جائے اور لوگ دور از کار تاویلات کے ذریعہ اپنی چاہت کو خدا کی چاہت کا رنگ دینے لگیں؛ اسی لئے ان مراجع اور ماٰخذ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جن کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی جائے گی، یہ ماٰخذ پانچ ہیں :

1- قرآن مجید
2- حدیث نبوی
3- آثارِ صحابہ
4- عربی زبان
5- عقل سلیم

7.5.1 قرآن سے قرآن کی تفسیر

پہلا درجہ ظاہر ہے کہ قرآن کا ہے، یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے کی جائے، جو لوگ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں اور قرآن پر ان کی وسیع نظر ہوگئی ہے، ان کو اس کا خوب اندازہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر و توضیح ہیں، پس قرآن مجید کی ایک آیت کی وہ تشریح سب سے اہم ہے جس کو دوسری آیت بیان کرتی ہے، قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تفسیر و تشریح کی مختلف صورتیں ہیں:

1- قرآن کی ایک آیت میں کوئی بات اجمال کے ساتھ کہی گئی، دوسری آیت نے اس کو واضح کر دیا، جیسے :

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : **فتلقی آدم من ربه کلمات فتاب علیه** ۔(بقرہ: 37)

حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔

یہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام نے سیکھے تھے، کیا تھے؟ اس آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے؛ لیکن دوسری آیت اس کو واضح کرتی ہے، چنانچہ ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**قالا ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین**''۔(اعراف:23)

آدم وحوا نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا ہے اور اگر آپ نے معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہیں فرمایا تو ہم ضرور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

----اس آیت نے واضح کر دیا کہ پہلی آیت میں کلمات سے یہی دُعاء مراد ہے۔

☆ اسی طرح سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے دُعاء کرائی ہے :

''**إهدنا الصراط المستقیم ، صراط الذین أنعمت علیهم**''۔(الفاتحہ:7-6)

ہمیں سیدھا راستہ دکھایئے، ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا۔

----اب سوال یہ ہے کہ انعام یافتہ لوگوں سے کون لوگ مراد ہیں اور اس انعام سے مادی انعام مراد ہے یا روحانی انعام؟ اس آیت میں یہ بات واضح نہیں ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

''**أولئک الذین أنعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین**''۔(نساء:69)

یہی لوگ ہیں کہ جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

----اس آیت نے واضح کر دیا کہ یہاں انعام سے روحانی انعام مراد ہے اور انعام یافتہ لوگوں سے اس آیت میں مذکورہ چار گروہ مراد ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ''**و أنفقوا مما رزقناکم**''۔ (منافقون:10)

ہم نے جو کچھ عطا کیا ہے، اس میں سے خرچ کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رزق میں سے'' کچھ حصہ'' خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ لیکن کتنا حصہ خرچ کیا جائے؟ یہ واضح نہیں ہے،---دوسری جگہ ارشاد ہے :

''**ویسألونک ماذا ینفقون قل العفو**''۔ (بقرہ:219)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے: بچا ہوا۔

اس دوسری آیت نے واضح کردیا کہ ''کچھ حصہ'' سے بچا ہوا حصہ مراد ہے۔

2- کبھی ایک جگہ مشترک لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے، دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ یہاں لفظ مشترک کا کونسا معنی مراد ہے؟ ---- جیسے :

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : **''ولیطوفوا بالبیت العتیق''**۔ (الحج:29)

اور چاہئے کہ ''بیت عتیق'' کا طواف کریں۔

''عتیق'' کے معنی قدیم اور پرانے کے ہیں، اس طرح اس آیت کے معنی ہوئے کہ'' قدیم گھر کا طواف کرنا چاہئے'' ---- قدیم گھر متعدد ہوسکتے ہیں اور کسی بھی گھر کا نام ''بیت عتیق'' رکھا جاسکتا ہے، قرآن مجید کی ایک اور آیت ''بیت عتیق'' کی مراد کو واضح کرتی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''إن أول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکا''۔ (آلِ عمران: 96)

بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے (عبادت کی غرض سے بنایا گیا) مکہ میں ہے، جو برکت والا ہے

معلوم ہوا کہ بیت عتیق --- جس کے طواف کا حکم دیا گیا ہے، --- سے مراد مکہ میں تعمیر ہونے والا ''کعبۃ اللہ'' ہے، جو عبادت الٰہی کے لئے تعمیر ہونے والا سب سے قدیم گھر ہے۔

☆ اسی طرح ایک جگہ فرمایا گیا: **''واللیل اذا عسعس''**۔(تکویر:17)

آیت میں اللہ تعالیٰ نے رات کی قسم کھائی ہے اور اس کی کیفیت ''**عسعس**'' کے ذریعہ بیان کی ہے، **عسعس** کے معنی رات کے ''آنے کے'' بھی ہیں اور ''جانے کے'' بھی، قرآن میں دوسری جگہ فرمایا گیا: **''واللیل اذا سجیٰ''** (ضحیٰ:3) ''رات کی قسم! جب وہ چھا جائے'' --- اس سے معلوم ہوا کہ رات کا آنا مراد ہے۔

3- بعض دفعہ ایک جگہ کوئی حکم کسی قید کے بغیر مطلقاً مذکور ہوتا ہے، دوسری جگہ وہی حکم قید کے ساتھ مذکور ہوتا ہے، اس سے وضاحت ہوتی ہے کہ یہ حکم قید کے ساتھ ہے بلا قید کے نہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله''۔(المائدہ:5)

جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے، اس کا عمل رائیگاں ہوجائے گا۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

''ومن یرتدد منکم عن دینه فیمت وهو کافر فأولئک حبطت اعمالهم''۔ (البقرۃ:217)

اور تم میں سے جو دین سے مرتد ہوجائے اور کفر کی حالت میں مرے، اس کے اعمال حبط ہوجائیں گے۔

اس دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ مرتد کے نیک اعمال اس وقت حبط ہوں گے، جب کہ کفر ہی پر اس کی موت ہوئی ہو، اگر اس نے

ارتداد سے توبہ کرلی اور دوبارہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا، تو اس کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے۔

☆ قرآن مجید میں حرام غذاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا : **حرمت علیکم المیتة والدم** . (مائدہ:3)

تم پر مردار اور خون حرام کئے گئے ہیں۔

---دوسری جگہ حرام اشیاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''**أو دماً مسفوحاً** ''(انعام:145)''.....یا بہتا ہوا خون''---معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں بھی مطلق خون مراد نہیں ہے؛ بلکہ بہتا ہوا خون مراد ہے۔

4- بعض دفعہ ایک آیت میں کوئی نامانوس لفظ استعمال ہوتا ہے، دوسری آیت میں اس مفہوم کو معروف ومتداول لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس طرح ایک لفظ سے دوسرے لفظ کی تشریح ہوجاتی ہے، جیسے :

''**وأمطرنا علیهم حجارة من سجیل**''۔ (الحجر:74)

اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسائے۔

---اس میں ''**سجیل**'' سے گاڑے سے بنا ہوا کنکر مراد ہے، یہ بات'' **لنرسل علیهم حجارة من طین** ''(ذاریات:33) سے واضح ہوتی ہے۔

5- کبھی ایک جگہ کسی واقعہ کو اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے، جیسے :

''**وإذ واعدنا موسیٰ اربعین لیلة ثم اتخذتم العجل من بعده**''۔ (بقرہ:51)

اور وہ وقت بھی یاد کئے جانے کے لائق ہے، جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا۔

دوسری جگہ چالیس راتوں کی تفصیل ہے کہ پہلے تیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دیا گیا، پھر اس پر دس راتوں کا اضافہ کیا گیا:

''**وواعدنا موسیٰ ثلاثین لیلة واتممنا ها بعشر فتم میقات ربه اربعین لیلة**''۔(اعراف:142)

قرآن مجید میں انبیاء اور مختلف فرقوں کے واقعات عام طور پر اسی طرح ذکر کئے گئے ہیں، کہیں مختصر اور مبہم، کہیں مفصل اور وضاحت کے ساتھ۔

6- کبھی ایک جگہ کوئی حکم عموم کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تخصیص کی جاتی ہے، جیسے :

''**الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة**''۔ (النور:2)

زنا کرنے والے مرد وعورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :

''**فعلیهن نصف ما علی المحصنات من العذاب**''۔ (النساء:25)

باندیوں کے لئے شادی شدہ کے مقابلہ نصف سزا ہے۔

معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں جو سو کوڑے کی سزا ہے، اس کا تعلق آزاد مردوں اور عورتوں سے ہے، غلاموں اور باندیوں کی سزا اس کے مقابلہ میں نصف ہے، یعنی پچاس کوڑے۔

7- قرآن سے قرآن کی تفسیر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض کلماتِ قرآن کے سلسلہ میں ایک سے زیادہ قراءتیں منقول ہیں، ان میں ایک قرأت دوسری قرأت کی مراد متعین کرنے میں معاون ہوتی ہے، جیسے :

☆ کفارۂ قسم کے سلسلہ میں فرمایا گیا: ''**فصیام ثلاثة ایام**''۔ (مائدہ:88) یعنی: پس تین دن روزہ رکھنا ہے---حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ''**فصیام ثلاثة ایام متتابعات**'' ہے۔یعنی: پس تین دن لگا تار روزہ رکھنا ہے، اس سے یہ بات اخذ کی گئی ہے کہ کفارہ کے یہ تین روزے مسلسل رکھے جانے ضروری ہیں۔

اسی طرح قرآن کی بہت سی آیتیں ہیں، جو ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں۔

7.5.2 حدیث سے تفسیر

تفسیر کا دوسرا ماخذ حدیث نبوی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ آپ اپنے قول وعمل کے ذریعہ قرآن مجید کی توضیح فرمائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

''**وأنزلنا إلیک الذکر لتبین للناس مانزل إلیهم**''۔ (نحل:44)

اور ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل فرمایا ہے کہ جو باتیں ان کی طرف نازل کی گئی ہیں، انھیں آپ ان پر واضح فرمادیں۔

----اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا سب سے بڑا ماخذ 'حدیث' ہے اور جن کتابوں کو 'تفسیر بالماثور' کی کتابیں کہا جاتا ہے، انھیں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید کی تشریح وتوضیح میں حدیث کا کتنا اہم کردار ہے؟

حدیث سے قرآن کی توضیح کی چند بنیادی صورتیں یہ ہیں :

1- قرآن میں بہت سے احکام نہایت اجمال کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور ان کی کیفیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، حدیث اس اجمال کی توضیح کرتی ہے، جیسے :

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''**أقیموا الصلوٰة وآتوا الزکوٰة**''۔نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، لیکن کیفیاتِ نماز اور احکام زکوٰۃ کی تفصیل حدیث کے بغیر متعین نہیں ہوسکتی۔

☆ طواف کا حکم دیا گیا، ''**ولیطوفوا بالبیت العتیق**''۔ (الحج:29) لیکن طواف کا طریقہ ہمیں حدیث میں ہی ملتا ہے۔

☆ ارشاد ہوا کہ زمین کی حلال وطیب چیزوں کو کھاؤ، **کلوا مما فی الأرض حلالا طیباً** (البقرۃ:168)؛ لیکن حلال وطیب میں کونسی چیزیں داخل ہیں اور کونسی چیزیں اس سے باہر ہیں؟ یہ ہمیں حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے۔

2- قرآن مجید میں بعض اشیاء کا بھی مبہم ذکر فرمایا گیا ہے، جیسے :

☆ ''**إنا اعطیناک الکوثر**''۔ (کوثر:1)

ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے۔

اب اس آیت میں ''کوثر'' سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت حدیث سے ہوتی ہے، کہ یہ ایک خاص حوض ہے، جس سے میدان حشر میں آپ ﷺ اپنی اُمت کو پانی عنایت فرمائیں گے۔

☆ اسی طرح ارشاد ہے: ''**لمسجد اسس علی التقوی**''۔(توبہ:108) اس سے کونسی مسجد مراد ہے؟---یہ ہمیں حدیث وسیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ 'مسجد قبا' اس کا مصداق ہے۔

3- قرآن میں بہت سے عددی اشارات ہیں، ان کی توضیح ہمیں حدیث کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی، مثلاً :

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ثانی اثنین إذ هما فی الغار**''۔ (توبہ:40)

دو میں کا دوسرا جب وہ دونوں غار میں تھے۔

----اب یہ بات کہ ثانی اثنین سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مراد تھے، حدیث ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وعلی الثلاثة الذین خلفوا**''، (توبہ:118) یعنی ''پیچھے رہ جانے والے تین لوگوں پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی تھی'' ---اب تین لوگوں سے کون صحابہ مراد ہیں؟ اس کا علم حدیث ہی سے ہوسکتا ہے، کہ یہ تین کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہم تھے، جو غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے---یہ چند مثالیں ہیں، ان کے علاوہ بھی قرآن میں بہت سے عددی اشارات ہیں، جن کی توضیح وتشریح حدیث کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

4- قرآن میں بعض واقعات کی طرف مبہم اشارہ کیا گیا ہے، حدیثیں یہ بتاتی ہیں کہ اس کی مراد کیا ہے اور صاحب واقعہ کون ہیں؟

☆ جیسے ارشاد ہے: ''**عبس وتولیٰ أن جائه الأعمی**''۔(عبس:1-2)

پیشانی شکن آلود ہوگئی اور چہرہ پھیر لیا کہ ان کے پاس نابینا آگئے۔

----اب یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر شکن آگیا اور آنے والے نابینا حضرت عبداللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ تھے، ہمیں حدیث ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

☆ اسی طرح ارشاد ربانی ہے: ''**وإذ أسرّ النبی إلی بعض أزواجه حدیثاً**''۔(تحریم:3)

اور جب نبی نے اپنی بعض بیویوں سے ایک بات راز داری کے ساتھ کہی۔

راز داری والی بات کیا تھی؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی یہ بات کس زوجہ سے فرمائی تھی؟ اسے حدیث کے بغیر نہیں جانا جاسکتا، حدیث بتاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو راز دار بنایا تھا۔

5- قرآن مجید کے بعض الفاظ ایسے ہیں، جن میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے، حدیث اس احتمال کو متعین کرتی ہے، جیسے ارشاد ہے :

''**حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطی**''۔(بقرہ:238)

نمازوں اور (خاص کر) درمیانی نماز کی پابندی کرو۔

چوں کہ نمازیں پانچ ہیں، اس لئے ہر نماز بقیہ نمازوں کی نسبت سے درمیانی نماز ہے، اب سوال یہ ہے کہ 'صلاۃ وسطی' سے کونسی نماز مراد ہے؟ حدیث نے بتایا کہ اس سے نماز عصر مراد ہے۔

6- اسی طرح قرآن مجید کے بعض مشکل مقامات کی توضیح حدیث کے بغیر نہیں ہوسکتی، جیسے قرآن میں فرمایا گیا :

''**الذین آمنوا ولم یلبسوا إیمانھم بظلم أولئک لھم الأمن وھم مھتدون**''۔(انعام:83)

جولوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے لئے (آخرت کا) امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

----قرآن کی زبان میں ہر گناہ ظلم ہے، تو بظاہر اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو ایمان کے ساتھ کسی بھی گناہ کا مرتکب ہو، وہ آخرت کے امن کو نہیں پاسکتا، ظاہر ہے یہ ایسی بات ہے کہ اس کے بعد کسی بھی انسان کی نجات دشوار ہے، اس لئے صحابہ کو اس سے بہت گرانی ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مراد واضح فرمائی کہ یہاں ظلم سے شرک مراد ہے، جو سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کے لئے قرآن مجید ہی کی آیت پیش فرمائی:''**إن الشرک لظلم عظیم**''۔(لقمان:13)

7- کبھی قرآن مجید میں کوئی حکم عموم واطلاق کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمومی حکم سے بعض صورتیں مستثنیٰ بھی ہیں یا یہ کہ یہ حکم بلا قید نہیں ہے، جیسے :

☆ آیت میراث (نساء:11) بہ ظاہر عام ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں جن رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے، وہ بہر حال اس کے ترکہ میں وارث ہوں گے؛ لیکن حدیث واضح کرتی ہے کہ قاتل اور غیر مسلم اپنے مقتول اور مسلمان رشتہ دار سے وارث نہیں ہوں گے۔

8- کبھی قرآن مجید میں وارد ہونے والا کوئی لفظ اپنی مراد کے اعتبار سے نامانوس ہوتا ہے، حدیث سے اس کا مصداق متعین ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''**وکذالک جعلناکم امۃ وسطا**''۔ (بقرہ:114) ہم نے تم لوگوں کو اُمت وسط بنایا۔

یہاں ''وسط'' سے کیا مراد ہے؟ یہ وضاحت طلب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح ''عدل'' سے فرمائی، یعنی اُمت محمدیہ عدل واعتدال کی حامل اُمت ہے۔

9- بعض واقعات کی طرف قرآن مجید میں محض اشارہ کردیا گیا ہے، حدیث کے ذریعہ ہمیں ان واقعات کی تفصیل معلوم ہوتی ہے، جیسے ''واقعۂ اسراء ومعراج، اصحابِ اخدود کا قصہ''۔

7.5.3 تفسیر اور آثارِ صحابہ

تفسیر کا تیسرا ماخذ، صحابہ کے اقوال وارشادات ہیں، جس شخص نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو اور اسلام

ہی پر اس کی موت ہوئی ہو، اس کو'' صحابی'' کہتے ہیں---صحابہ نے چوں کہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کو سیکھا اور سمجھا ہے؛ اس لئے قرآن وحدیث کی تشریح وتوضیح میں ان کی وضاحتوں اور اقوال کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور جن آیات کی تفسیر میں قرآن وحدیث سے روشنی نہیں ملتی ہو، ان میں صحابہ کے اقوال تفسیر کا سب سے اہم ماخذ ہیں۔

صحابہ کے تفسیری اقوال تین طرح کے ہیں :

(الف) ایسے اقوال جن میں ذاتی قیاس واجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور غالب گمان ہو کہ انھوں نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی نقل کیا ہوگا۔

(ب) وہ اقوال جن میں ذاتی اجتہاد وقیاس کی گنجائش ہو۔

(ج) وہ اقوال جو پچھلی اقوام سے متعلق ہوں اور اس بات کا امکان ہو کہ انھیں اہل کتاب سے سنا گیا ہوگا۔

(الف) پہلی قسم کے تفسیری اقوال معتبر ہیں اور حدیث کے درجہ میں ہیں، اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قرآن مجید کی آیت''**لقد رأى من آيات ربه الكبرى**''(نجم:18) یعنی: تحقیق کہ انھوں نے اپنے رب کی بڑی نشانی دیکھی ہے۔ کے سلسلہ میں فرمایا کہ اس سے''سفید رفرف'' مراد ہے، جو پورے اُفق پر چھا گیا تھا۔(بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر:4858)

☆ ''**فكان قاب قوسين أو أدنى فأوحى الى عبده ما أوحى**''(نجم:10-9) یعنی: پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک۔ کے سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی روایت ہے کہ اس سے حضرت جبرئیل مراد ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی اصل شکل میں دیکھا؛ جب کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔(بخاری: کتاب التفسیر، حدیث نمبر:4856)

☆ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جن صاحب کا ذکر ہے، ان کے نام کی صراحت نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ یہ حضرت خضر ہیں۔(بخاری: کتاب الانبیاء، حدیث نمبر:2400)

☆ سورۂ طور میں''سقف مرفوع''(بلند چھت) کا ذکر آیا ہے،(طور:5)---حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس سے آسمان مراد ہے (طبری:18/27)

اس طرح کے بہت سے تفسیری اقوال ہیں، جن میں اجتہاد کو دخل نہیں اور بہ ظاہر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی انھوں نے فرمایا ہوگا، ایسے اقوال اگر مستند طور پر ثابت ہوں تو وہ حدیث کے درجہ میں ہیں اور حجت ہیں۔

صحابہ کی تفسیر مختلف جہتوں سے قرآن مجید کے سمجھنے میں معاون بنتی ہے۔

1- کبھی اس سے مبہم ومجمل مضامین کی وضاحت ہوتی ہے، جیسے :

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''**هذان خصمان اختصموا في ربهم**''۔(الحج:19)

یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیت غزوۂ بدر میں حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے عقبہ، شیبہ اور ولید کے مقابلہ نکلنے کے سلسلہ میں ہے۔

☆ آیت قرآنی : ''**إدفع بالتی ھی احسن**''۔(فصلت:34)

برائی کا بھلائی سے دفاع کرو۔

میں بہتر طریقہ پر دفاع سے کیا مراد ہے؟ ---حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غصہ کے وقت صبر سے کام لے اور فریق مخالف کی طرف سے بدسلوکی و بدکلامی پر معاف کردے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''**ولنذیقنھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر**''۔ (سجدہ:21)

بالیقین ہم انھیں قریب کے چھوٹے سے بعض عذاب اس بڑے عذاب کے سوا چکھائیں گے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریبی عذاب سے مراد دنیا کے مصائب ہیں۔

2- مضامین قرآن کو سمجھنے میں ان واقعات کی بڑی اہمیت ہے، جن کے پس منظر میں آیات نازل ہوئی ہیں، اس سلسلہ میں آثار صحابہ سے بڑی روشنی ملتی ہے، مثلاً :

☆ ''**إذ جاء وکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذا زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر**''۔ (احزاب:10)

جب کہ دشمن تمہارے پاس اوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آ گئے

اس آیت میں کس موقع کا نقشہ کھینچا گیا ہے؟ --- یہ ہمیں حضرت عائشہؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس میں غزوۂ خندق کے زمانہ کا ذکر ہے۔

☆ زمانۂ جاہلیت میں جن بتوں کی پوجا کی جاتی تھی، ان میں ایک کا نام ''لات'' تھا، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر آیا ہے، (نجم:19) --- حضرت عبداللہ بن عباس کے قول سے وضاحت ہوتی ہے کہ ایک شخص حاجیوں کے لئے ستو گوندھنے کی خدمت انجام دیتا تھا، یہ بت اسی کی یادگار کے طور پر تھا۔ (بخاری، حدیث نمبر:4859)

☆ قرآن مجید میں حج کے افعال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:''**ثم افیضوا من حیث افاض الناس**''۔ (بقرہ:199)

پھر تم اس جگہ سے (جا کر) لوٹو، جہاں سے سب لوگ لوٹتے ہیں۔

''لوگ'' کہاں جا کر لوٹتے تھے اور حاجیوں کو کہاں جانے کا حکم ہے؟ --- قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے، اس کی وضاحت حضرت عائشہؓ کے ارشاد سے ہوتی ہے کہ قریش حج میں مزدلفہ تک جاتے تھے اور عرفات چوں کہ حرم سے باہر ہے، اس لئے وہاں نہیں جاتے تھے اور اس کو اپنا امتیاز خیال کرتے تھے، دوسرے حجاج عرفات بھی جاتے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہل مکہ کو حکم دیا گیا ہے، کہ جیسے

دوسرے لوگ عرفات جاتے ہیں، اہل مکہ کو بھی عرفات جانا چاہئے۔

3- قرآن مجید کی بہت سی آیات کسی خاص واقعہ کی وجہ سے نازل ہوئی ہیں، اگرچہ ان آیات میں دیئے گئے احکام عام ہیں اور انھیں واقعات کے ساتھ خاص نہیں ہیں، تاہم ان واقعات سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، ان کو اصطلاح میں ''اسبابِ نزول'' یا ''شانِ نزول'' کہا جاتا ہے، ان کی بھی تفسیر میں خاص اہمیت ہے، زیادہ تر اسبابِ نزول صحابہ ہی سے منقول ہیں۔

4- قرآن مجید میں بعض احکام اس طرح ذکر کئے گئے ہیں کہ بہ ظاہر وہ عام معلوم ہوتے ہیں، صحابہ کے تفسیری اقوال سے وضاحت ہوتی ہے کہ بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ بھی ہیں، جیسے عدت وفات کے سلسلہ میں قرآن مجید کا بیان ہے :

''**والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجا يتربصن بانفسهن أربعة اشهر وعشراً**''۔(بقرہ:234)

اور تم میں سے جن کی وفات ہوجائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ چار ماہ دس روز رکی رہیں۔

بہ ظاہر اس آیت میں حاملہ اور غیر حاملہ تمام بیوہ عورتوں کی عدت چار ماہ دس دن بتائی گئی ہے؛ لیکن حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ یہ حکم ان عورتوں کے لئے ہے، جو حاملہ نہ ہوں، حاملہ کی عدت بچہ کی ولادت تک ہی ہے، خواہ ولادت چار ماہ دس دنوں کے بعد ہو یا اس سے پہلے ہی ہوجائے؛ کیوں کہ حاملہ کی عدت قرآن مجید کی ایک اور آیت میں یہی بیان کی گئی ہے: ''**وأولات الاحمال أجلهن أن يضعن حملهن**''۔(طلاق:4)

5- اسی طرح صحابہ کی تفسیر سے بعض آیات کے بارے میں وضاحت ہوتی ہے کہ ان آیات کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، جیسے:

☆ ''**وعلى الذين يطيقونه ، فدية طعام مسكين**''۔ (بقرہ:184)

اور جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ ایک مسکین کے کھانے کے ذریعہ فدیہ بھی دے سکتے ہیں۔

حضرت سلمہ بن اکوع اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کے بارے میں کہا کہ یہ ''**فمن شهد منكم الشهر فليصمه**''۔ (البقرۃ: 185) ''جس پر بھی ماہ رمضان آئے، اسے روزہ رکھنا چاہئے'' سے منسوخ ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ''**وإن تبدو مافى انفسكم أو تخفوه يحاسبكم به الله**''۔ (بقرہ:284)

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ حکم منسوخ ہے۔

غرض کہ آثار صحابہ تفسیر قرآن کے لئے ایک اہم ماخذ ہے، اسی لئے جو کتابیں 'تفسیر بالماثور' کے منہج پر لکھی گئی ہیں، ان میں کثرت سے صحابہ کے آثار نقل کئے گئے ہیں اور اگر صحابہ کے تفسیری اقوال معتبر سندوں سے نقل کئے گئے ہوں تو وہ تفسیر میں معتبر و مقبول ہیں۔

(ب) صحابہ کے بعض تفسیری اقوال ان اُمور سے متعلق ہیں، جن میں قیاس و اجتہاد کی گنجائش ہے، یہ اقوال حجت نہیں ہیں، جیسے :

☆ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سورۃ نصر کے بارے میں فرمایا کہ اس میں ''فتح'' سے فتح مکہ مراد ہے اور اشارہ ہے کہ اب آپ

کی وفات کا وقت قریب آچکا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے۔

☆ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا گیا کہ قرآن مجید میں ایک طرف کہا گیا ہے کہ قیامت میں کوئی رشتہ یاد نہیں رہے گا اور لوگ ایک دوسرے سے کچھ دریافت کرنے کا بھی یارانہ پائیں گے'' **فلا انساب بینهم یومئذ ولا یتسائلون** ''۔ (مومنون:101) دوسری طرف فرمایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے استفسار کریں گے'' **وأقبل بعضهم على بعض يتساء لون** ''۔ (صافات:27) ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے؟---عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پہلی آیت میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے، وہ قیامت میں دوسرا صور پھونکنے کے بعد ہوگی اور دوسری آیت کا تعلق تیسرے صور پھونکنے کے بعد سے ہے۔ (بخاری: کتاب التفسیر، تفسیر حم السجدہ)

☆ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی نے'' **کأسادهاقا** '' (عم:34) کی تفسیر ایسے پیمانوں سے کی ہے، جو بھرے ہوئے ہوں اور مسلسل دیئے جائیں، اور انھوں نے اس پر زمانۂ جاہلیت کے استعمال سے استدلال کیا ہے۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ صحابہ نے کوئی بات پچھلی اقوام یا کتابوں سے متعلق کی ہو، یہ حجت نہیں ہے؛ البتہ اگر اس کا مضمون کتاب وسنت کے مغائر نہیں ہو تو اسے قبول کیا جاسکتا ہے، مثلاً قرآن مجید کی آیت :

'' **فإنها محرمة عليهم أربعين سنة يتيهون فى الأرض** ''۔ (المائدہ: 26)

......وہ (بیت المقدس) ان پر چالیس سال کے لئے حرام ہے، وہ زمین میں بھٹکتے رہیں گے۔

--- کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے تفصیل منقول ہے کہ اس وقت جن لوگوں کی عمر بیس سال تھی، ان لوگوں کا میدان تِیہ میں انتقال ہوگیا، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی بھی وفات ہوگئی اور حضرت یوشع نے بیت المقدس کو فتح کیا--- اسی نوعیت کی روایت ہے، چوں کہ اس تفصیل کا کتاب وسنت سے تعارض نہیں ہے، اس لئے اس کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

7.5.4 تفسیر اور عربی زبان ولغت

تفسیر کا چوتھا ماخذ 'عربی زبان ولغت' ہے، قرآن مجید عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، عربی لغت اور عربی قواعد کے محاورات کے بغیر قرآن مجید کو سمجھا نہیں جاسکتا؛ اس لئے ظاہر ہے کہ عربی زبان تفسیر قرآن کا ایک اہم ترین ماخذ ہے؛ لیکن اگر خود قرآن مجید کی کسی آیت سے یا حدیث اور صحابہ کے متفقہ قول سے معلوم ہو کہ کوئی لفظ اپنے معنی لغوی میں استعمال نہیں ہوا ہے، تو وہاں لغوی معنی پر وہ تشریح مقدم ہوگی، جو قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے ثابت ہو۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : '' **اِنها بقرة صفراء فاقع لونها** ''۔ (البقرہ:69)

اہل علم نے'' صفراء'' کا ترجمہ نہایت زرد رنگ سے کیا ہے؛ لیکن بعض حضرات نے نہایت سیاہ سے بھی اس کا ترجمہ کردیا ہے، یہ عربی زبان سے ناواقفیت کی بنیاد پر ہے، علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اگر اونٹ کے لئے'' صفراء'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے سیاہ اونٹ مراد ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اس کی سیاہی زردی مائل ہوا کرتی ہے، برخلاف بقرہ (گائے) کے، کہ اس کی صفت'' صفراء'' لائی جائے تو زرد رنگ ہی مراد

ہوتا ہے۔

عربی زبان سے کما حقہ واقف نہ ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ مضحکہ خیز غلطی ہو جاتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

''**یوم ندعوا کل اناس بامامھم**''۔ (اسراء:71)

یہاں 'امام' کے معنی سردار کے ہیں؛ لیکن بعض لوگوں نے 'امام' کو اُم (ماں) کی جمع مان لیا اور اس آیت کا مطلب یہ سمجھا کہ قیامت میں لوگوں کو ماؤں کی نسبت سے بلایا جائے گا؛ حالاں کہ ''ام'' کی جمع ''امہات'' آتی ہے نہ کہ امام۔

اسی طرح قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''**فقلنا اضرب بعصاک الحجر**'' ۔ (البقرۃ:7) ---یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ پتھر پر اپنی لاٹھی سے ماریں، اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑیں گے،---بعض لوگوں نے یہاں ''ضرب'' کے معنی مارنے کے بجائے چلنے کے کئے ہیں، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھ جائیں، مگر یہ تفسیر درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہاں ضرب کا صلہ ''ب'' آیا ہے اور جب صلہ ''ب'' ہو تو اس کے معنی مارنے کے آتے ہیں اور جب اس کا صلہ ''فی'' ہو تب چلنے کے معنی آتے ہیں۔

7.5.5 تفسیر اور عقل سلیم

تفسیر قرآن کا پانچواں ماخذ 'عقل سلیم' ہے، بہت سی آیات کا مفہوم عقل اور اہل عقل کی تحقیق سے متعین ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بچہ کے رحم مادر میں ہونے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''**فی ظلمات ثلاث**''۔ (زمر:6) یعنی ''جنین تین تاریک پردوں کے اندر ہوتا ہے''۔ حیرت انگیز طور پر آج کی سائنس یہ بتاتی ہے کہ جنین واقعی تین پردوں میں ہوتا ہے، پیٹ کی دیوار، رحم مادر کا پردہ اور بچہ دانی کی اندرونی جھلی، اس طرح کے بہت سے سائنسی حقائق ہیں، جنھوں نے قرآن کی بعض آیات کے سمجھنے کو آسان کر دیا ہے؛ لیکن اس میں دو باتیں نہایت اہم ہیں:

اول: یہ کہ ہر عقل، عقل سلیم نہیں ہوتی، اس لئے جو شخص جو کچھ سمجھ لے قرآن مجید کے الفاظ کو اس پر منطبق کرنے لگے، یہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ انسان کی عقل ٹھوکر کھاتی رہتی ہے۔

دوسرے: قرآن کا اصل موضوع ہدایت ہے، یعنی انسان کو خدا سے جوڑنا اور اسے خدا کی مرضیات اور منہیات کے بارے میں بتانا؛ اس لئے بہ تکلف قرآن سے عقلی تصورات کو ثابت کرنا درست نہیں، ورنہ مستقبل میں اگر نظریات بدل جائیں اور گذشتہ فکر غلط ثابت ہو، تو قرآن مجید کی حقانیت کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

تفسیر قرآن کے دو ایسے ماٰخذ کا ذکر بھی ضروری ہے، جو نا معتبر ہیں:

7.5.6 اسرائیلی روایات

اول: اسرائیلی روایات، اس سے مراد بائبل کے بیانات ہیں، چوں کہ قرن اول ہی میں بہت سے علماء اہل کتاب نے اسلام قبول کیا تھا اور قرآن مجید میں متعدد ایسے واقعات موجود ہیں، جن کا ذکر تورات و انجیل میں بھی ہے، اس لئے بعض علماء اسلام نے تفسیر میں معلومات میں

اضافہ کے لئے اسرائیلی روایات کوشامل کردیااور بتدریج یہ غیر معتبر روایتیں تسلیم شدہ اقوال کے طور پر نقل ہوتی گئیں، اس سے تفسیر کے صاف و شفاف مواد کو بہت نقصان پہنچااور بعض ایسی باتیں تفسیر کا حصہ بن گئیں، جو اسلامی تعلیمات کے بالکل مغائر ہیں، یا جن میں انبیاء کرام کی عظمت کو مجروح کیا گیا ہے، یا وہ عقل ومشاہدہ کے خلاف ہیں، اس لئے اسرائیلیات کے سلسلے میں علماء کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ یہ روایات تین طرح کی ہیں :

ایک: وہ جن کا درست ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے،---ان کو قبول کیا جائے گا۔

دوسرے: وہ جو قرآن وحدیث سے متعارض ہوں یا عقل کے خلاف ہوں،--- ان کا اعتبار نہیں اور ان کو بلاتنقید نقل کرنا بھی درست نہیں۔

تیسرے: وہ اسرائیلی روایات ہیں جو نہ پہلی قسم میں داخل ہیں اور نہ دوسری قسم میں، ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے گا، نہ ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں نہ تکذیب، اسرائیلیات کے بارے میں اس اُصول کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہے :

''لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوه وقولوا آمنا بالله وما انزل الينا''۔

(بخاری: کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر:4485)

اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو، نہ انھیں جھٹلاؤ، اور کہو ہم اللہ پر اور اللہ کی طرف سے ہم پر جو کتاب نازل ہوئی ہے، اس پر ایمان لائے۔

7.5.7 تفسیر بالرائ

دوسرے: محض اپنی رائے کی بناء پر قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

''من قال فى القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ''۔

(ترمذی: باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برایہ، حدیث نمبر:2952)

جو شخص قرآن مجید میں اپنی رائے سے کلام کرے، اگر وہ صحیح بات بھی کہے، تب بھی اس نے غلطی کی۔

----اس حدیث میں ہر رائے کی مذمت کرنا مقصود نہیں ہے، جو رائے قرآن وحدیث کے مطالعہ، قواعد شرعیہ اور علم وتحقیق پر مبنی ہو، وہ تو مطلوب ہے، یہاں رائے سے مراد ''خودرائی'' ہے، یعنی کوئی شخص پہلے سے کوئی رائے قائم کرلے اور بہ تکلف اسے قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرے؛ حالاں کہ قرآن وحدیث، آثارِ صحابہ اور عربی زبان ولغت اس رائے کے خلاف جاتے ہوں۔

یہاں اس کی چند مثال ذکر کی جاتی ہے :

☆ **''وجوه يومئذ ناضرة الى ربها ناظرة''۔** (القیامۃ:22)

اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

چوں کہ معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ہوسکتا ہے نہ آخرت میں، اور اس آیت سے جنت میں دیدار

الٰہی کا ثبوت مل رہا ہے؛ اس لئے انھوں نے ''**ناظرۃ**'' کا مفہوم بیان کیا کہ وہ اللہ کی طرف اُمید لگائے ہوں گے، یہ ظاہر ہے عربی لغت کے خلاف ہے۔

☆ ''**وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً**''۔ (النساء:164)

اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے گفتگو کی۔

چوں کہ بعض لوگ اللہ کے انسان سے گفتگو کرنے کو محال سمجھتے ہیں؛ اس لئے انھوں نے یہاں ''**کَلَّمَ**'' کو ''**کَلَمَ**'' سے ماخوذ مانا ہے جس کے معنی زخم کے آتے ہیں، پھر اس آیت کی تشریح اس طرح سے کی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو مصائب کے ناخنوں اور فتنوں کے پنجوں سے زخمی کیا۔

☆ اسی طرح روافض نے بہت سی آیات کی تشریح کی اور اس کے ظاہری معنی سے ہٹ کر اپنی فکر کی تائید کے لئے حسبِ خواہش تشریح کی، جیسے:

☆ ''..... **ولا تقربا ھذہ الشجرۃ**''۔ (البقرۃ:35)

(اے آدم وحوا!) تم دونوں اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔

اس آیت میں جنت کے ممنوعہ درخت کا ذکر ہے؛ لیکن بعض شیعہ مفسرین کے نزدیک اس درخت کا نام ''شجرۂ علم'' ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے لئے مخصوص ہے، دوسروں کو اس میں سے کھانے کی اجازت نہیں، یہ تفسیر حسن عسکری کی طرف منسوب ہے، ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں یا حدیثوں میں کہیں اس کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں۔

☆ اسی طرح علامہ طبرسی نے قرآن مجید کی آیت:

''**انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ وھم راکعون**''۔

(المائدہ:55)

بے شک تمہارے دوست اللہ، اس کے رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں اور وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں۔

---کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں ''**الذین آمنوا**'' سے سیدنا حضرت علیؓ مراد ہیں اور اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلافصل ہیں---ظاہر ہے کہ اس دعویٰ پر قرآن مجید کے الفاظ میں کوئی دلیل نہیں؛ کیوں کہ ''الذین آمنوا'' جمع کا صیغہ ہے اور تمام مومنوں کو شامل ہے، اگر حضرت علیؓ مراد ہوتے تو اللہ نے وضاحت کے ساتھ ان کا نام ذکر فرمایا ہوتا۔

جہاں قرآن مجید کے حفاظ اور قراء کے ذریعہ قرآن مجید کے الفاظ کی حفاظت ہوئی ہے، وہیں تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین نے اخذ و استنباط کے جو اُصول مقرر کئے ہیں، ان سے قرآن مجید کے معانی کی حفاظت ہوئی ہے اور تحریف معنوی کا راستہ بند ہوا ہے۔

7.6 خلاصہ

قرآن مجید کی بعض عبارتیں مجمل اور قابل وضاحت ہیں، ان کی تشریح کو تفسیر کہتے ہیں، تفسیر سے قریب ایک اور لفظ ''تاویل'' ہے، اگر قرآن مجید کے معنی تک پہنچنے میں غور و استنباط کی ضرورت نہ پیش آتی ہو تو زیادہ تر اسے تفسیر کہا جاتا ہے اور اگر غور و استنباط کے ذریعہ معنی اخذ کیا جائے، تو اس کو ''تاویل'' کہا جاتا ہے، قرآنی آیات کی مراد کو سمجھنے کے لئے دوسری آیاتِ قرآنی، احادیث، صحابہ کے اقوال، عربی لغت اور عقل سلیم سے مدد لی جاتی ہے؛ البتہ ایسی اسرائیلی روایات --- جو قرآن مجید کی تعلیمات اور اسلام کی فکر سے متصادم ہوں --- غیر معتبر ہیں، اسی طرح ایسی رائے کا بھی اعتبار نہیں، جس پر کوئی معتبر دلیل موجود نہ ہو۔

7.7 نمونۂ سوالات

مختصر جوابی سوالات:

1۔ تفسیر کی لغوی و اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق واضح کیجئے۔

2۔ تفسیر کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

3۔ تفسیر میں عربی زبان و لغت جاننے کی کیا اہمیت ہے؟ مثالوں سے واضح کیجئے۔

طویل جوابی سوالات:

1۔ تفسیر قرآن مجید کے مآخذ (قرآن، حدیثِ نبوی، آثارِ صحابہ) سے تفسیر میں کس کس طرح مدد ملتی ہے؟ تفصیل سے لکھئے۔

2۔ تفسیر میں عقل سلیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اسرائیلی روایات سے متعلق مفسرین کے نقطۂ نظر سے بحث کیجئے؟

3۔ تفسیر میں رائے کی کیا حیثیت ہے؟ تفصیل سے لکھئے۔

7.8 فرہنگ

ادوار : (دور کی جمع) زمانہ۔

اسراء : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے بیت المقدس کی طرف معجزاتی سفر۔

اصحابِ اخدود : گڑھے والے، ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس کا قرآن مجید کی سورہ نمبر: ۸۵ میں ذکر آیا ہے۔

اعتدال : میانہ روی۔

اولین : سب سے پہلا/ پہلی۔

بے آمیز : ملاوٹ سے پاک۔

بیتِ عتیق : پرانا گھر (کعبۃ اللہ شریف مراد ہے)۔

تحریف معنوی	:	معنی میں اُلٹ پھیر۔
تعلیقاً	:	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے احادیث وآثار کو نقل کرنا اور سند ذکر نہ کرنا۔
تکذیب	:	جھٹلانا
تنقید	:	جانچنا' پرکھنا
جاہلیت	:	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کا زمانہ۔
جبریہ	:	ایک فرقہ جو انسان کو اپنے افعال میں مجبور محض خیال کرتا تھا۔
حبط	:	بیکار' ضائع۔
حجت	:	دلیل۔
خودرائی	:	اپنی ہی رائے کو درست اور کافی سمجھنا۔
سند	:	روایت نقل کرنے والوں کا سلسلہ۔
شانِ نزول	:	وہ واقعہ جس کی وجہ سے کوئی آیت اُتری ہو۔
شواہد	:	گواہیاں، دلیلیں۔
صَرف	:	عربی زبان (گرامر) سے متعلق ایک فن۔
صلہ	:	(حرف) لغت کی اصطلاح میں وہ حرف جو کسی فعل کو اسم سے مربوط کرنے کے لئے آتا ہے۔
طَیِّب	:	پاکیزہ' حلال
عدت	:	شوہر سے علیحدگی یا اس کی وفات کے بعد ایک مخصوص مدت، جس میں عورت دوسرا نکاح نہیں کرسکتی۔
عدل	:	انصاف۔
فدیہ	:	عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے سے واجب ہونے والا مال، یعنی: ایک روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا
قدریہ	:	ایک فرقہ، جو انسان کو اپنے افعال کے بارے میں قادر مطلق مانتا ہے کہ اس میں اللہ کی مشیت کا کوئی دخل نہیں۔
قرنِ اول	:	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا زمانہ
ماخذ	:	جس سے کوئی علمی مواد حاصل کیا جائے۔
مبہم	:	جو بات واضح نہ ہو۔

متبادر : جس بات کی طرف بلاسوچے ذہن منتقل ہوجائے۔

مرویات : روایتیں۔

معراج : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس سے آسمانوں تک کا معجزاتی سفر۔

مفردات القرآن : قرآن مجید کے مشکل یا کم استعمال ہونے والے الفاظ۔

منسوخ : وہ آیت یا حدیث، جس کا حکم باقی نہیں ہو۔

موضوع : جس علم میں جس چیز سے بحث کی جاتی ہے وہ اس کا موضوع ہوتا ہے، جیسے: میڈیکل سائنس کا موضوع' انسانی جسم اور دوائیں' ہیں۔

نحو : (عربی گرامر سے متعلق ایک فن)' جس سے زبر' زیر اور پیش وغیرہ کی تعیین کی جاتی ہے۔

واضع (حدیث) : (حدیث) گھڑنے والا۔

7.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1۔ تدوین قرآن : مولانا سید مناظر احسن گیلانی

2۔ تاریخ القرآن : ڈاکٹر عبدالصمد صارم ازہری

3۔ جمع قرآن : مولانا تمنا عمادی

4۔ علوم القرآن (اُردو ترجمہ) : ڈاکٹر صبحی محمصانی

5۔ علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی

6۔ علوم القرآن : ڈاکٹر احسن الدین

7۔ منازل العرفان فی علوم القرآن : مولانا محمد مالک کاندھلوی

8۔ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی : مولانا ابوالحسن علی ندوی

9۔ تفسیر میں اسرائیلی روایات : مولانا اسیر ادروی

-:oOo:-

اکائی 10 : تفسیر کی تاریخ (حصہ اول)

اکائی کے اجزاء

10.1 تمہید

10.2 مقصد

10.3 تفسیر: عہد نبوی ﷺ میں

10.3.1 تفسیر بذریعہ قرآن کریم

10.3.2 تفسیر بذریعہ احادیث نبویہ ﷺ

10.4 تفسیر: عہد صحابہ میں

10.4.1 عہد صحابہ کی تفسیری کاوشیں

10.4.2 بعض اہم مفسر صحابہ کرام

10.5 تفسیر: عہد تابعین میں

10.5.1 بعض مفسر تابعین عظام

10.5.2 عہد تابعین کی بعض تفسیریں

10.6 اکتسابی نتائج

10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی سوالات

10.7.2 مختصر جوابی سوالات

10.7.3 طویل جوابی سوالات

10.8 تجویز کردہ کتابیں

10.1 تمہید

اس اکائی میں تفسیر قرآن کا تاریخی جائزہ لیا جائے گا۔ عہد نبوی ﷺ میں تفسیر قرآن کا کیا طریقہ تھا؟ اس دور کے تفسیری مآخذ کیا تھے؟ اس کے بعد عہد صحابہ میں کن صحابہ کرام نے اہم تفسیری خدمات انجام دیں؟ اس دور کا کیا تفسیری سرمایہ ہے؟ عہد صحابہ کے بعد عہد تابعین میں تفسیر کا کس طرح ارتقاء ہوا؟ اور اس دور کے اہم مفسرین اور ان کی تفسیری کاوشوں کا اس اکائی میں تعارف پیش کیا جائے گا۔

10.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد تفسیر قرآن کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ لینا، عہد نبوی ﷺ، عہد صحابہ اور ان کے بعد تابعین کے دور کے اہم مفسرین کا تعارف پیش کرنا، تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا جائزہ لینا، اور اس کے ساتھ ہی ان ادوار کی تفسیری کاوشوں کا تعارف پیش کرنا بھی ہے۔

10.3 تفسیر: عہد نبوی ﷺ میں

10.3.1 تفسیر بذریعہ قرآن کریم:

قرآن کریم کی تفسیر کا آغاز اس کی پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، گویا یہی اس کی تاریخ کا نکتہ آغاز بھی تھا۔ یہ پہلا دور عہد نبوی ﷺ کا ہے۔ اس دور میں قرآن کریم کی تفسیر کے دو بنیادی مآخذ تھے، پہلا خود کلام الٰہی 'قرآن کریم' اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی حدیث وسنت۔ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے اصول تفسیر کے ماہرین نے جو اصول پیش کئے ہیں، اس کے پیش نظر قرآن کریم کی تفسیر سب سے پہلے خود آیات قرآنیہ کے ذریعہ کی جائے گی۔ قرآن کریم میں ایک ہی مضمون کی مختلف آیتیں، مختلف اوقات، حالات اور مواقع کی مناسبت سے الگ الگ جگہوں پر مذکور ہیں۔ ایک ہی واقعہ کسی جگہ اختصار کے ساتھ مذکور ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، یا کسی جگہ ایک حکم اجمال کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور دوسری جگہ اس کی توضیح اور تفصیل آ گئی ہے۔ یعنی قرآن کریم کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی تشریح وتوضیح اور تفسیر بیان کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پہلے دور میں جب قرآن کریم کے نزول کا سلسلہ جاری تھا، تو لازماً قرآنی آیات کی تفسیر کا یہ طریقہ اس دور میں رہا، تا آنکہ آنحضور ﷺ مالک حقیقی سے جا ملے اور نزول وحی کا سلسلہ رک گیا۔ آیئے اس کی چند مثالوں پر نظر ڈالتے ہیں:

1- سورہ بقرہ کے بالکل آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ [قرآن کریم] ایسی کتاب ہے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس میں متقیوں کے لئے ہدایت ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نمازیں قائم کرتے ہیں اور اللہ نے انھیں جو عطا کیا ہے اس میں سے [اللہ کی راہ میں] خرچ کرتے ہیں ''**الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلاۃ ومما رزقناھم ینفقون**''۔ (سورہ بقرہ:3) اس آیت کریمہ میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ مومنین کو اللہ کی نعمتوں میں سے کس قدر خرچ کرنا چاہئے؟ کیا انھیں اللہ کی راہ میں سب کچھ خرچ کر دینا چاہئے یا کچھ بہت اپنی ضرورتوں کے لئے رکھنے کی اجازت ہے۔ اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی ہی آیت نمبر 219 میں دیا ہے، فرماتے ہیں: ''**ویسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو، کذالک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون**''، یعنی مومنین پوچھتے ہیں کہ انھیں کیا خرچ کرنا چاہئے، [اے رسول!] آپ کہہ دیجئے: جو ضرورت سے زائد ہو۔ گویا یہ آیت پہلی آیت کی وضاحت اور تفسیر ہے کہ ضرورت سے زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا مومنین کا شعار ہے۔

2- شروع شروع میں جب مسلمانوں پر روزہ فرض کیا گیا تو کھانے پینے اور دوسری چیزوں کی اجازت افطار سے محض عشاء کی نماز تک تھی، یعنی رخصت کا وقت محض عشاء تک تھا۔ لیکن بعد میں اس رخصت کے وقت میں اضافہ کر کے صبح صادق تک کر دیا گیا، اس کے لئے آیت نازل ہوئی ''.....**وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود**''۔ (سورہ بقرہ:187) یعنی جب تک سفید اور سیاہ دھاگوں میں فرق واضح نہ ہو جائے کھانے پینے اور دوسری چیزوں کی اجازت ہے، چنانچہ بعض صحابہ کرام اس فرق کے ادراک کے لئے اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگے باندھ لیتے تھے اور وہ کھاتے پیتے رہتے تھے تا آنکہ ان دونوں میں فرق واضح ہو جاتا تھا۔ پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کے لئے ''**من الفجر**'' کا لفظ نازل فرما دیا، جس سے یہ بات

واضح ہوگئی کہ سفید اور سیاہ دھاگے کے فرق سے مراد صبح کی سفیدی کا رات کی سیاہی سے ظاہر ہونا ہے۔(بخاری:4511)

3- ''والملائکة یسبحون بحمد ربهم ویستغفرون لمن فی الارض الا ان الله هو الغفور الرحیم ''(شوریٰ:5)اس آیت میں فرشتوں سے متعلق یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور زمین والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔سورہ غافر کی آیت 7 میں ان زمین والوں کی وضاحت کردی گئی ہے جن کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:''یسبحون بحمد ربهم ویؤمنون به ویستغفرون للذین آمنوا''،یعنی فرشتوں کا استغفار مومنین کے لئے خاص ہے، نہ کہ تمام اہل زمین کے لئے۔

4- ''ام تریدون ان تسئلوا رسولکم کما سئل موسیٰ من قبل ''(سورہ بقرہ:108) قرآن کریم کی اس آیت میں مسلمانوں کو پیغمبر اسلام ﷺ سے بیجا سوالات کرنے سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے ان کی قوم سوالات کیا کرتی تھی۔ یہاں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ موسیٰؑ کی قوم آپؑ سے کس قسم کے سوالات کیا کرتی تھی۔قرآن کریم میں سورہ نساء کی آیت 153 میں اس کی وضاحت ملتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''یسئلک اهل الکتاب ان تنزل علیهم کتابا من السماء فقد سالوا موسیٰ اکبر من ذالک، فقالوا ارنا الله جهرة فاخذتهم الصاعقة بظلمهم ''،یعنی اہل کتاب آپ سے آسمان سے کوئی کتاب اتارنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو[اس میں کوئی تعجب نہیں] انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا، انھوں نے کہا: ہمیں اللہ سامنے سے دکھادو، چنانچہ ان کی زیادتی کی وجہ سے بجلی نے ان کو آ پکڑا۔

10.3.2 تفسیر بذریعہ احادیث نبویہ ﷺ:

قرآن کریم کی تفسیر کے دوسرے اصول کی رو سے اگر کسی آیت کی تفسیر قرآن کریم میں نہ ملے تو اس کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال وافعال کی طرف رجوع کیا جائے گا، کہ آپ ﷺ نے اس سے متعلق کیا رہنمائی فرمائی ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نازل فرمایا تو ساتھ ہی اس میں دیئے گئے احکام اور اِس دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے فراہم کردہ رہنمایانہ ہدایات کی تشریح اور توضیح کے لئے نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور اسے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ اور چونکہ آپ ﷺ کی تمام تر سرگرمیاں خود خالق کائنات کے زیرنگرانی اور اس کی مرضی کے مطابق انجام پائیں، لہٰذا آپ ﷺ کی ہر ایک بات اور ہر ایک عمل قرآنی آیات کی تفسیر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

''وما ینطق عن الهویٰ، ان هو الا وحی یوحیٰ، علمه شدید القوی''۔(سورہ نجم:5-3)

(اپنی نفسانی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے، یہ تو وحی ہے جو ان پر اتاری جاتی ہے، ان کو بڑے طاقتور فرشتے نے تعلیم دی ہے)۔

اور سورہ نساء میں فرمایا:

''انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک الله''۔(آیت:105)

(بے شک ہم نے آپ کی طرف برحق کتاب اتاری ہے؛ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ آپ کو سمجھائے، فیصلہ کریں)۔

ایک دوسری جگہ آپ ﷺ کی اس حیثیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا:

''وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون''۔(سورہ نحل:44)

(ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ لوگوں پر ان ہدایات کو اچھی طرح واضح کر دیں، جو ان کی طرف بھیجی گئی ہے، تا کہ وہ غور وفکر کریں)۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیه وھدیً ورحمةً لقوم یومنون''۔(سورہ نحل:64)

(اور ہم نے آپ پر کتاب اسی لئے اتاری ہے کہ جن باتوں میں یہ جھگڑ رہے تھے، ان باتوں [کی حقیقت] کو آپ ان پر واضح کر دیں اور یہ ایمان لانے والوں کے لئے سراپا ہدایت اور رحمت ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سند کے باوجود کہ آپ ﷺ جو کچھ بولتے یا کرتے ہیں وہ سب اللہ کے منشاء کے مطابق ہوتے ہیں، بسا اوقات آپ ﷺ بعض آیتوں کی تفسیر بیان کرنے سے رک جاتے تھے، تا آنکہ اس کی تشریح وتوضیح میں اللہ عزوجل خود کوئی آیت نازل فرما دیتے تھے۔ اس دور میں ہمیں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر قرآنی آیات اور اس کے احکام کی براہ راست تشریح وتفسیر میں آپ ﷺ سے جو احادیث روایت کی گئی ہیں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ محدثین نے انھیں اپنی کتابوں میں مستقل ابواب کے تحت جمع کئے ہیں۔ ان احادیث کے علاوہ آپ ﷺ کی زندگی کی حیثیت قرآن کریم کے عملی نمونہ اور تشریح وتوضیح کی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کی اس حیثیت کو مختلف مقامات پر نمایاں کیا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیراً''۔(سورہ احزاب:21)

(اللہ کے پیغمبر کی ذات میں تم میں سے ان لوگوں کے لئے بہترین نمونہ ہے جو اللہ کا اور آخرت کا یقین رکھتے ہوں اور اللہ کو خوب یاد کرتے ہوں)۔

دوسری جگہ سورہ حشر کی آیت نمبر 7 میں فرمایا:

''وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب''۔(سورہ حشر:7)

(جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ، اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

اور رسول اللہ ﷺ نے اسی چیز کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''انما بعثت معلماً''۔(ابن ماجہ، حدیث نمبر:229)

(میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔

قرآنی آیات اور ان میں مذکور احکام کی تشریح وتوضیح اور تفسیر احادیث میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ ان کی تفسیر میں کبھی ایسا ہوا کہ آپ ﷺ عمومی طور پر لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے اور مختلف قرآنی

آیات کے احکام کی وضاحت فرمادیتے، کبھی لوگوں کی مختلف سرگرمیوں کے پیش نظر اللہ کی ہدایات پر روشنی ڈالتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کچھ ارشاد فرماتے اور اس سے متعلق یہ صراحت فرمادیتے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا اس کام کو اللہ تعالیٰ نے جائز یا ناجائز قرار دیا ہے، فلاں کام کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔ کبھی اصحاب رسول ﷺ میں سے کوئی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کوئی مسئلہ دریافت کرتے تو آپ ﷺ اسے محض زبانی بتانے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ اسے عملی طور پر کر کے دکھاتے تھے، مثلاً ایک شخص کے نماز سے متعلق دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس طرح نماز پڑھو جیسا کہ تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔ (بخاری، حدیث نمبر: 631) ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ کے سامنے کوئی بات پیش آتی یا آپ ﷺ کو صحابہ کرام کے کسی عمل کا علم ہوتا تو اس کے صحیح یا غلط اور جائز یا ناجائز ہونے سے متعلق کوئی حکم بیان فرمانے کے بجائے خاموشی اختیار کرتے تھے۔ تو آپ ﷺ کی یہ خاموشی بھی اللہ کی جانب سے آپ ﷺ کے دل میں ڈالی ہوئی بات ہوتی تھی، لہٰذا یہ بھی اللہ کے حکم کی تشریح اور تفسیر ہے۔ یہ تمام صورتیں قرآن کریم کی تفسیر میں داخل ہیں، کیونکہ آنحضور ﷺ قرآن کریم کے شارح اور ترجمان تھے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ سے جو روایتیں منقول ہیں، ان کی چند مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں:

1- ''**الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الأمن وھم مھتدون**'' (سورہ انعام: 82) (جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کی آمیزش سے محفوظ رکھا، ان ہی کے لئے اطمینان کا موقع ہے اور وہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔) قرآن کریم کی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام کافی بے چین ہوگئے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ ان میں کون ہوگا جنہوں نے ظلم نہ کیا ہوگا اور اس سے ان کا ایمان آلودہ نہ ہوگیا ہوگا۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی بے چینی دور فرماتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے، جیسا کہ حضرت لقمانؑ نے اپنے صاحبزادہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''**واذ قال لقمان لابنہ وھو یعظہ، یا بنی لا تشرک باللہ، ان الشرک لظلم عظیم**'' (سورہ لقمان: 12) (اور وہ وقت یاد کئے جانے کے لائق ہے جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، یقیناً شرک کرنا بڑی ہی ناانصافی کی بات ہے۔)

2- جن وارثین کو میراث میں حصہ ملے گا ان کی تفصیل قرآن کریم نے بتادی ہے۔ قرآن کریم کی جن آیتوں میں میراث سے متعلق حصے متعین کئے گئے ہیں ان سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ان وارثین کو ہر حال میں میراث میں سے حصہ ملے گا۔ لیکن حدیث نبوی ﷺ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ ''**القاتل لا یرث**'' (ترمذی: 2109) ''**لا یرث المسلم الکافر، ولا الکافر المسلم**'' (ترمذی: 2107) یعنی اگر کوئی وارث انتقال ہونے والے شخص کا قاتل ہو یا کوئی وارث غیر مسلم ہو تو وہ اس مقتول یا مسلم شخص کا وارث نہیں بنے گا۔

3- ''**واحل اللہ البیع وحرم الربا**'' (سورہ بقرہ: 275) (اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام) بظاہر اس آیت سے تجارت اور خرید و فروخت کی تمام شکلوں کے جائز اور درست ہونے کا خیال ہوتا ہے لیکن ہمیں اس کی تفصیل حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ تجارت کی کون کون سی شکلیں شریعت کے دائرہ میں جائز ہیں اور کون سی ناجائز، اسی طرح ''ربا'' کے معنی لغت میں اضافہ ہونے کے ہیں، تو کیا تجارت کے ذریعہ یا دوسرے ذرائع سے انسان اپنے مال میں جو بڑھوتری اور اضافہ حاصل کرتا ہے وہ شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ اس سلسلہ میں احادیث نبویہ ﷺ وضاحت بیان کرتی ہے کہ یہاں پر ''ربا'' کا صحیح معنی و مفہوم کیا ہے، اس سے مراد

دراصل 'سوئ' ہے۔

4- ''وامسحوا برء وسکم'' (سورہ مائدہ:06) اس آیت میں وضو میں سر کے مسح سے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ سر کا مسح کریں، لیکن مسح کرنے کا صحیح طریقہ یہاں نہیں بتایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں اس کے طریقہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سر کے کتنے حصہ پر مسح کر لینا کافی ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ دیگر تفصیلات بھی حدیث شریف میں ملتی ہیں۔

اوپر عرض کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کریم کی تفسیر اور تشریح ہے اور اس کی چند مثالیں بھی پیش کی گئیں۔ ان کے علاوہ بھی قرآن کریم میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے احادیث نبوی ﷺ لازمی اور ضروری ہیں۔ صحابہ کرام جو عربی زبان سے بخوبی واقف تھے جب قرآن کریم میں نماز، زکاۃ، روزہ، حج، جہاد، اخلاق، بر و تقویٰ، نکاح و طلاق اور معروف و منکر وغیرہ سے متعلق آیات نازل ہوئیں تو انھوں نے ان احکام کی تعمیل آپ ﷺ کی احادیث و سنتوں کی روشنی میں ہی کی، انھیں کے مطابق اپنی زندگی میں عمل پیرا ہوئے اور اسی کو آگے بڑھایا۔

اس دور میں شروع میں قرآن اور غیر قرآن میں التباس اور آمیزش کے اندیشہ کے پیش نظر آپ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرما دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے کئی صحابہ کرام کو کتابت حدیث کی اجازت بھی دی تھی، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ ایک انصاری صحابی کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے، لیکن ان کو آپ ﷺ کی باتیں یاد نہیں رہتی تھیں، تو وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے ان احادیث کو دوبارہ سنانے کی درخواست کرتے تھے اور حضرت ابو ہریرہؓ ان کو حدیثیں سنا دیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے حافظہ کی شکایت حضور اقدس ﷺ سے کی، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اپنے حافظہ کی مدد اپنے دائیں ہاتھ سے کرو، اور اپنے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ کیا۔ (ترمذی:2666)

حضرت عبداللہؓ بن عمرو مشہور صحابی ہیں۔ ان کی احادیث پر مشتمل کتاب ''الصحیفۃ الصادقۃ'' کے نام سے ہے۔ یہ احادیث کا مجموعہ عہد نبوی ﷺ ہی میں تیار ہو گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں آپ ﷺ سے احادیث بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے اپنے حافظہ کی مدد کے لئے حدیثیں لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں؟ آنحضور ﷺ نے جواب دیا: یہ میری حدیثیں ہیں تم لکھ لیا کرو۔ (سنن دارمی:502)

شروع میں ان مخصوص افراد کو کتابت حدیث کی اجازت کے بعد جب آیات قرآنیہ کے ساتھ ان کے التباس کا خدشہ نہ رہا تو عام اجازت دے دی گئی تھی۔ یہ سب گویا قرآنی آیات کی تفسیر اور احکام الٰہی کی تشریح و توضیح کو تحریری شکل دینے کا آغاز تھا۔

10.4 تفسیر: عہد صحابہ میں

عہد نبوی ﷺ کے بعد عہد صحابہ میں عموماً کسی آیت کی تفسیر وہی کی جاتی تھی جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا یا جس کا سبب نزول انہوں نے خود ملاحظہ کیا تھا۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد قرآن کریم کی تدوین، فتوحات کی وجہ سے جدید شرعی مسائل اور دیگر ملکی معاملات سے صحابہ کرام دوچار رہے۔ لہٰذا تفسیر قرآن کے لئے زیادہ کوششیں نہ ہو سکیں۔ لیکن اس کے باوجود اس دور کی بعض تفسیری روایات کے مجموعے ملتے ہیں جنہیں صحابہ کرام نے جمع کئے تھے۔ ان کے علاوہ صحابہ کرام کی آیات قرآنیہ کے سلسلہ میں انفرادی آراء بھی ہیں، مثلاً ایک صحابی نے اجتہاد کی بنیاد پر میراث کے مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، پھر بعد میں اسی کے مطابق ایک حدیث مل گئی تھی تو انہوں نے اپنی بے انتہاء خوشی کا اظہار کیا تھا۔ بسا اوقات صحابہ کرام نے اجتماعی طور پر بھی تشریح و توضیح کی کوششیں کیں۔

[اس دور میں بعض ایسے حضرات بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے جو پہلے یہودیت یا نصرانیت سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار وغیرہ، لہٰذا تفسیر قرآن عموماً پچھلے انبیاء واقوام اور بسا اوقات بعض مسائل میں بھی اسرائیلی روایات سے بھی مدد لی جانے لگی تھی۔]

عہد خلافت راشدہ میں قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صحابہ کرام میں مجموعی اعتبار سے سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہیں۔ خلفائے راشدین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سب سے زیادہ تفسیری روایات منقول ہیں۔ علاقوں کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیری روایات کو مکہ مکرمہ میں، مدینہ میں حضرت ابی بن کعب اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی تفسیری روایات نے خاص طور پر مقبولیت اور رواج حاصل کی، اور پھر بعد میں ان کے شاگردوں نے ان روایات کو آگے بڑھایا۔ اس دور میں مختلف صحابہ کرام قرآن کریم کے مختلف احکام ومسائل میں اختصاص رکھتے تھے، مثلاً میراث سے متعلق مسائل پر حضرت زید بن ثابتؓ کو اختصاص حاصل تھا، فقہی احکام ومسائل میں حضرت معاذ بن جبلؓ مقام بلند پر فائز تھے۔ قرآن کریم کی بہترین قرأت اور فن تجوید میں حضرت ابی بن کعبؓ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ قرآن کریم سے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علم وفضل کی تعریف خود رسول عربی ﷺ نے فرمائی تھی۔

10.4.1 عہد صحابہ کی تفسیری کاوشیں:

اس دور میں بعض صحابہ کرام نے اپنی تفسیری روایات کو تحریری شکل بھی دینے کی کوشش کی تھی۔ جن میں پہلا نام حضرت ابی بن کعبؓ کا ہے۔ آپ کی یہ تحریر پورے قرآن کی تفسیر پر محیط نہیں تھی، البتہ قرآن کریم کے بڑے حصہ سے متعلق تفسیری روایات اس میں جمع تھیں۔ آپ کے شاگردوں میں سے ابوالعالیہ آپ کی تفسیری روایات کو نقل کرتے تھے، پھر بعد میں ربیع بن انس کے واسطہ سے ابوجعفر رازی اور ان کے بعد ابن جریر، ابن ابی حاتم اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے آپ کی تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ آپؓ کا یہ تفسیری مجموعہ پانچوی صدی ہجری تک موجود رہا۔ تفسیری روایات پر مشتمل ایک اور تحریر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب ہے۔ یہ تحریر دراصل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں کی وہ روایات ہیں جنہیں وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مجلس درس میں سنتے تھے اور انھیں اپنے پاس تحریری شکل میں محفوظ کر لیتے تھے۔ یہی تحریریں بعد میں تفسیر ابن عباس کے طور پر معروف ہوگئیں۔ آپؓ کے شاگردوں میں مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے مضبوط اور مستند تفسیری روایت وہ ہے جسے علی بن ابی طلحہ نے مجاہد یا سعید کے واسطہ سے نقل کیا ہے، اور ان میں ضعیف ترین روایت وہ ہے جسے کلبی، ابوصالح کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام تر اقوال وافعال دراصل قرآن کریم کی تفسیر، تشریح اور توضیح ہیں۔ لہٰذا صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے جو بھی روایتیں نقل کیں اور ان کو تحریری شکل دی، وہ دراصل قرآن کریم کی تفسیر کے ضمن ہی میں شمار ہوگی۔ اس دور میں بڑے بڑے مسائل بہت جلد پیش آ گئے، مثلاً نومسلموں کا اسلام سے پھر جانا، زکاۃ دینے سے انکار کرنا، جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنا، قرآن کریم کا ایک جگہ جمع کرنا، وراثت کے بعض اہم مسائل، مفتوحہ علاقوں کے بعض اہم مالی وانتظامی مسائل، فوج کی تشکیل، بیت المال کا قیام، باغیوں اور خارجیوں سے مقابلہ وغیرہ۔ ان مسائل میں کسی بھی طرح کا حکم جاری کرنے سے پہلے خلفائے راشدین صحابہ کرام سے مشورہ کرتے، وہ آپس

میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ان مسائل کو حل کرنے اوران کا شرعی حکم معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے، پھران احکام کا اجراء ہوتا اوران پر عمل درآمد ہوا جاتا۔ یہ سب دراصل کلام الٰہی کی تفسیر کی کوششیں تھیں۔ جو مرکزی مقامات تھے ان میں جلیل القدر صحابہ بطور مفتی وقاضی اور شرعی رہنما ورہبر متعین کئے جاتے تھے جو قرآن وسنت کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عمر فاروقؓ نے شرعی امور سے متعلق رہنمائی کے لئے کوفہ بھیجا تھا، اور وہاں کے گورنر کو تاکید کی تھی کہ تمام ضروری امور میں ان سے مشورہ ضرور کیا کریں۔ اس کے علاوہ سلطنت کے تمام گوشوں اور محاظوں پر قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ فوجی چھاؤنیوں میں جب افراد جہاد کے لئے تربیت پا رہے ہوتے اور اس کی تیاری ہو رہی ہوتی، وہاں بھی معلم مقرر ہوتے تھے جو انھیں قرآنی تعلیمات دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں خلفائے راشدین کسی قسم کے تساہل اور غفلت کے روادار نہ تھے۔ مفتوحہ علاقوں میں معلمین کی زیادہ ضرورت پڑتی تھی۔ وہاں قرآن کریم کی صحیح تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کا لب ولہجہ، معنی ومفہوم اور احکام ومسائل وغیرہ تمام چیزیں سکھانے اور بتانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ قرآن کریم کے سلسلہ میں صحابہ کرام کی یہ تمام کوششیں دراصل تفسیر قرآن کے ضمن میں داخل ہیں۔

10.4.2 بعض اہم مفسر صحابہ کرام:

حضرت ابی بن کعبؓ: آپؓ صحابہ کرام میں سب سے بہترین قرآن کریم کی قرأت کرنے والے تھے، چنانچہ ''سید القراء'' کے طور پر آپ صحابہ کرام میں معروف تھے۔ آپؓ کاتبین وحی میں سے ہونے کے علاوہ عہد نبوی ﷺ میں ان اجلہ صحابہ کرام میں سے تھے جو فتویٰ دیا کرتے تھے۔ آپؓ کو وہ عظیم سعادت حاصل ہے جو کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے آپؓ کو سورہ بینہ تلاوت کر کے سنانے کی خواہش کی اور فرمایا کہ اے ابی! اللہ تعالیٰ نے تیرا نام لے کر فرمایا کہ میں قرآن پڑھوں اور تو سنے۔ آپؓ سے جو تفسیری روایات منقول ہیں ان کو امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جگہ دی ہے۔ قاضی محمد زاہد حسینی نے خلیفہ چلپی کے حوالہ سے اپنی کتاب ''تذکرۃ المفسرین'' میں نقل کیا ہے کہ ابی بن کعب نے تفسیر قرآن عزیز میں ایک بڑی کتاب لکھی تھی جس کی اسناد صحیح ہے۔ (ص:56) آپ سے 164 حدیثیں مروی ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ: آپؓ اصلاً ایران کے باسی تھے۔ ابتدائی عمر ہی میں اسلام قبول کر لئے تھے اور اس کے لئے بڑی تکلیفیں بھی برداشت کی تھیں۔ جب اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا اور اس کی سلطنت کی سرحدیں ایران تک پہنچ گئیں تو ایران کے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ لیکن عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے انھیں نماز پڑھنے میں کافی دشواری پیش آتی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنا یہ مسئلہ حضرت سلمان فارسیؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کے جواب میں سورہ فاتحہ کو فارسی زبان میں ترجمہ کر کے بھیج دیا، جسے وہ نومسلم ایرانی عربی زبان سیکھنے تک پڑھا کرتے تھے۔ (تذکرۃ المفسرین:58-57۔ بحوالہ مبسوط، ج:1، ص:37) گویا قرآن کریم کے کسی بھی حصہ کا ترجمہ کرنے والے پہلے شخص حضرت سلمان فارسیؓ ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ: آپؓ نبی اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ پورا بچپن آپ ﷺ کے زیر نگرانی گذرا، جب کچھ ہوش سنبھالا تو رسول اللہ ﷺ اسلام کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے اسے قبول کر لیا، چنانچہ اسی وقت سے قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے احکام ومسائل سے واقفیت حاصل ہوتی رہی، اور اس میں پختگی حاصل ہوتی گئی۔ اسی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ زیادہ تر تفسیری روایات حضرت علیؓ سے نقل کیا کرتے تھے۔ جسے اکثر اوقات خود بھی لکھ لیتے تھے اور آپ کے شاگرد بھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس تحریر کے متعلق

دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب دیا یہ ''فہم القرآن'' ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت علیؓ کی تفسیر میں مہارت سے متعلق فرماتے ہیں: قرآن کریم سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، ان میں ہر حرف کا ایک ظاہری معنی ومفہوم ہے اور دوسرا باطنی معنی ومفہوم۔حضرت علیؓ کو ان دونوں قسموں کے معانی ومفاہیم کی گہری واقفیت حاصل تھی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ: ازواج مطہرات میں آپؓ رسول اللہ ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں۔ابتدائے عمر ہی میں آپ ﷺ کی زوجیت میں آ گئی تھیں، اس لئے آپ ﷺ کی صحبت میں قرآنی تعلیمات اور اس کے احکام ومسائل کو سیکھنے اور جاننے کے زیادہ مواقع میسر آئے۔اسی علمی جلالت شان اور قرآن کریم کے گہرے علم کی وجہ آپؓ صحابہ کرام کے بعض ملکی وانتظامی فیصلوں پر تنقید کیا کرتی تھی۔اسی علمی قابلیت کی بناء پر آپؓ کے قرآن کریم اور حدیث نبویہ ﷺ کے حلقے لگتے تھے جن میں آپؓ درس دیا کرتی تھیں۔ان حلقوں میں بڑے بڑے صحابہ آپ کی شاگردی اختیار کرتے تھے۔انفرادی طور پر بھی لوگ آپؓ سے بکثرت علمی استفادہ کیا کرتے تھے۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: ہمیں جب بھی قرآن کریم سے متعلق کوئی مشکل یا دین وشریعت سے متعلق کوئی مسئلہ پیش آتا تو ہم حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ضرور رجوع کرتے، آپؓ ہمارے مسئلہ کا حل اور مشکل دور فرمادیا کرتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ: آپؓ نے بچپن ہی میں اسلام قبول کرلیا تھا۔آپؓ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ زوجہ مطہرہ حضرت میمونہؓ کے بھانجہ بھی تھے۔آپؓ اکثر اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے پاس رہتے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتے، اور آپ ﷺ کے روزانہ کے معمولات کا مطالعہ کرتے، انھیں سیکھنے اور برتنے کی کوشش کرتے تھے۔آپؓ کی انھیں کوششوں سے خوش ہوکر رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو دعا دی تھی کہ اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر کا علم سکھا۔(مستدرک حاکم:6280) ایک اور موقع پر فرمایا: ''**نعم ترجمان القرآن ابن عباس**'' (مصنف ابن ابی شیبہ:32220) (یعنی ابن عباس قرآن کریم کے بہترین ترجمان ہیں)۔انہی دعاؤں کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو دونوں طرح کے علوم سے بھرپور نوازا تھا۔اسی علم کی بنیاد پر آپؓ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں اصحاب شوراء میں بھی داخل تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کا روزانہ حلقہ درس لگا کرتا تھا، جس میں آپؓ قرآن وحدیث کا درس اور حاضرین کے سوالوں کے جواب دیا کرتے تھے۔آپؓ نے غیر عرب افراد کے لئے ترجمان رکھا تھا جو انھیں حضرت ابن عباسؓ کے دروس اور احکام ومسائل ان کی زبان میں سمجھایا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ تفسیری نکات کی بھی رہنمائی فرمایا کرتے تھے، جنہیں آپؓ کے شاگرد اپنے پاس نوٹ کرلیا کرتے تھے۔آپؓ کا طریقہ تدریس نہایت ہی مؤثر تھا، چنانچہ حضرت ابووائل فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت ابن عباس کو امیر حج مقرر کیا۔حج میں حضرت ابن عباسؓ نے ایسی مؤثر تفسیر بیان کی کہ اگر وہاں ترک، روم اور دیلم کے لوگ ہوتے تو وہ سب کے سب اسلام قبول کرلیتے۔آپؓ کے طریقہ تعلیم سے آپؓ کے بعض شاگرد اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ کئی کئی مرتبہ آپ کے حلقہ درس میں شریک ہوجایا کرتے تھے۔چنانچہ آپؓ کے ممتاز شاگرد مجاہد جن کا تفسیری روایات میں بڑا نام ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آپؓ کے درس میں تیس (30) مرتبہ اور ایک روایت کے مطابق تین (3) مرتبہ قرآن کریم پڑھا۔

آپؓ سے جن لوگوں نے علمی استفادہ کیا ان میں سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس، عطاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔آپؓ کی تفسیری روایات کی قوی ترین سند علی بن طلحہ ہاشمی (م:143ھ) کے واسطہ سے ہے۔اسی سند سے امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی تفسیری روایتیں اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔اس کے علاوہ آپؓ کے تفسیری اقوال کو ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی شافعی (م:810ھ) نے اپنی کتاب ''تنویر

المقیاس فی تفسیر ابن عباس'' میں جمع کر دیا ہے۔

تفسیر کی انھیں امتیازی خصوصیات کی بنیاد پر آپؓ کو ''ترجمان القرآن'' کہا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: حضرت عبداللہ بن مسعود ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن سے تفسیری روایات بڑی تعداد میں نقل کی گئی ہے۔قرآن کریم کے ساتھ ان کو بے انتہاء محبت وعقیدت تھی، اسی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے آپؓ سے فرمایا تھا کہ: تم قرآن کریم کی تلاوت کرو اور میں سنوگا۔ چنانچہ آپؓ نے سورہ نساء کی تلاوت فرمائی اور آپ ﷺ نے اسی سنا اور تحسین فرمائی۔خود فرمایا کرتے تھے کہ قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ قرآن کریم کی جو بھی آیت نازل ہوئی ہے اس کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ کس شخص کے متعلق اور کس جگہ نازل ہوئی ہے۔ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا علم جس کے پاس کتاب اللہ کا علم مجھ سے زیادہ ہو تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا، بشرطیکہ وہاں تک سواریاں جاسکتی ہوں۔(تفسیر ابن کثیر، ج:1،ص:9) ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ہم پہلے دس قرآنی آیات کو پڑھ لیتے تھے، اور ان کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کے بعد ان پر عمل کرتے تھے، پھر آگے دوسری آیات کی طرف بڑھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپؓ کوفہ چلے گئے تھے، جہاں آپؓ کے قرآن وحدیث کے درس کے حلقے لگا کرتے تھے، اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپؓ سے کسب فیض کرتے تھے۔

10.5 تفسیر: عہد تابعین میں

عہد صحابہ کے بعد تابعین نے علم تفسیر کو آگے بڑھایا۔انہوں نے صحابہ کرام سے جو کچھ حاصل کیا تھا انھیں بعد والوں تک پہنچایا۔جس طرح درس وتدریس کے حلقے لگتے تھے تابعین کے دور میں ان میں مزید اضافہ ہوا۔اس دور میں تفسیر الگ سے مستقل کوئی فن نہیں تھا، لہٰذا عموماً جو حدیث وفقہ میں مہارت رکھتے تھے وہ بھی علم تفسیر سے آراستہ ہوتے تھے۔مشہور فقہائے سبعہ (سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، خارجہ بن زید بن ثابت، عبیداللہ بن عبداللہ، سلیمان بن یسار، ابوبکر بن عبدالرحمٰن رحمہم اللہ) جو مدینہ میں مسلمانوں کے شرعی امام تھے انھیں علم تفسیر میں بھی مہارت حاصل تھی۔مکہ مکرمہ جہاں حضرت ابن عباسؓ کے درس کے حلقے لگا کرتے تھے، اور آپؓ سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا تھا، وہاں آپؓ کے شاگرد تفسیری خدمات انجام دیتے تھے، جن میں مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔پھر کوفہ میں پہلے حضرت ابن مسعودؓ اور دارالخلافہ کوفہ منتقل ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علمی فیوض سے وہاں کے لوگ مستفیض ہوئے تھے، لہٰذا ان کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو مرجع خلائق بنی ہوئی تھی۔اس جماعت میں ابراہیم نخعیؒ اور عامر بن شراحبیل شعبیؒ وغیرہ شامل تھے۔حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ، بصرہ میں علم تفسیر میں لوگوں کے مرجع تھے۔اسی دور میں ابوالعالیہؒ، ابوعبدالرحمٰن سلمی، امام ضحاک اور امام قتادہؒ وغیرہ تھے جو علم تفسیر وحدیث کے مقام بلند پر فائز تھے۔

تفسیر قرآن کے سلسلہ میں تابعین کرام نے بطور مآخذ یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب انھیں کسی آیت کی تفسیر دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر قرآن کریم میں اس کی تفسیر نہ ملتی تو احادیث مبارکہ سے مراجعت کرتے، اور اگر ان میں بھی انھیں کسی آیت کی تفسیر نہ ملتی تو صحابہ کرام کے آثار میں اس کی تفسیر تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ کسی آیت کی تفسیر انھیں ان تینوں مصادر میں نہیں ملی تو اس وقت انہوں نے اجتہاد اور غور وفکر سے کام لیا اور اس کی تفسیر کی۔[ان کے علاوہ عہد صحابہ کی طرح اسرائیلی روایات سے استفادہ کا چلن اس دور میں بھی جاری رہا۔]

10.5.1 بعض مفسر تابعین عظام:

صحابہ کرام سے جن افراد واشخاص نے علمی فیض اٹھایا تھا ان کی بہت بڑی تعداد ہے، لیکن جن شخصیات نے علم تفسیر کے موضوع پر خدمات انجام دیں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں ان میں سے بعض مفسرین کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

حضرت ابوالحجاج مجاہد بن جبیر المخزومی (متوفی: 103ھ): تابعین میں تفسیری روایات کے سلسلہ میں آپؒ کا نام نہایت ہی ممتاز تھا۔ آپؒ اصلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد خاص تھے، لیکن ساتھ ہی آپ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ آپؒ نے قرآن کریم حضرت ابن عباسؓ سے تیس مرتبہ پڑھا تھا، اور ایک دوسرے قول کے مطابق تین مرتبہ پڑھا تھا۔ بعض لوگوں نے ان دونوں اقوال کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ حفظ اور دور کے لئے آپؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے تیس مرتبہ قرآن کریم ختم کی اور ترجمہ وتفسیر کے ساتھ تین مرتبہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو حافظہ بڑا کمال کا عطا فرمایا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک مرتبہ انھیں مخاطب کر کے فرمایا: کاش میرے بیٹے سالم اور نافع کا حافظہ بھی تمہاری طرح ہوتا۔ آپؒ کی تفسیر ''تفسیر مجاہد'' حکومت قطر کے تعاون سے شائع ہوچکی ہے۔ آپ کی تفاسیر کا ایک مجموعہ مصر کے کتب خانہ ''خدیویہ'' میں موجود ہے۔

حضرت سعید بن جبیر الاسدی (متوفی: 94ھ): حضرت سعید بن جبیر نے حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت انس، حضرت عبداللہ بن مغفل اور حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہم کی شاگردی میں رہے تھے۔ اپنے وقت کے بڑی عظیم مفسر مانے جاتے تھے۔ حضرت قتادہ فرمایا کرتے تھے کہ تابعین میں علم تفسیر کے سب سے بڑے عالم حضرت سعید بن جبیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کا اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے آپؒ سے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ حضرت سعید بن جبیر نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تفسیر لکھ کر اس کے حوالہ کردی تھی، جسے اس نے شاہی کتب خانہ کا بہتر طریقہ پر حصہ بنادیا تھا۔ گویا یہ تفسیر کسی بھی مسلم حکمراں کے ذریعہ حکومت کی سرپرستی میں منظر عام پر آنے والی پہلی تفسیر تھی۔ پھر بعد میں حضرت سعید بن جبیر کے ایک شاگرد حضرت عطاء بن دینا نے اسے کسی طرح شاہی خزانہ سے حاصل کرلیا تھا اور اس سے تفسیری روایات نقل کیا کرتے تھے۔

حضرت عکرمہ مولی ابن عباسؓ (متوفی: 105ھ): حضرت عکرمہ، حضرت ابن عباسؓ کو ہدیہ میں ملے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور اسی محبت اور محنت سے انھیں تعلیم دی تھی، جس کی وجہ سے وہ علم تفسیر کے بڑے بلند مقام پر فائز ہوگئے تھے۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت علی، حضرت حسن بن علی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت جابر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کی بھی شاگردی اختیار کی۔ ان سب سے آپؒ روایتیں بھی نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے حصول علم کے لئے مختلف مقامات مثلاً مصر، شام، عراق، افریقہ وغیرہ کے اسفار بھی کئے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے چالیس سالوں تک علم حاصل کیا ہے۔ ان کی علم تفسیر میں مہارت کا اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شعبی جو خود اپنے وقت کے بڑے عالم تھے فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں علم تفسیر اور کتاب اللہ کا ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ قتادہ بن دعامہ بھی ان کے تفسیری کمالات کے معترف تھے۔ حضرت عکرمہ سے امام بخاری، امام مسلم اور امام مالک سبھی نے روایتیں نقل کی ہیں اور انھیں اپنی اپنی کتابوں کا حصہ بنایا ہے۔

حضرت طاؤس بن کیسان (متوفی: 106ھ): آپؒ کا پورا نام ابوعبدالرحمٰن طاؤس بن کیسان الحمیری الجندی ہے۔ آپؒ کے استاذ صحابہ کی فہرست کافی لمبی ہے جن میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت

زید بن ارقم رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔بعض لوگوں نے آپؒ کے استاذ صحابہ کی تعداد 49 تک شمار کرائی ہے۔(تذکرۃ المفسرین از قاضی محمد زاہد الحسینی:67) چونکہ آپؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد تھے،لہٰذا ان کی روایت سے آپؒ نے تفسیر مرتب کی تھی۔آپؒ سے روایت کردہ مختلف حدیثیں صحاح ستہ اور دیگر معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔آپؒ نے چالیس حج کئے تھے۔

ابوالعالیہ رفیع بن مہران بصری (متوفی:93ھ): آپؒ نے عہد خلافت ابوبکرؓ میں اسلام قبول کیا۔قبولیت اسلام کے بعد آپؒ نے اجلہ صحابہ کرام سے استفادہ کیا۔حضرت عمر فاروقؓ سے تین مرتبہ قرآن کریم پڑھا،حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے علم تفسیر حاصل کی۔ ان صحابہ کرام کے علاوہ آپؒ نے حضرت علی، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابوایوب انصاری اور حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے بھی اپنی علمی پیاس بجھائی۔آپؒ کے علمی کمال کی بنیاد پر حضرت ابن عباسؓ آپ کو اپنی چارپائی پر بٹھایا کرتے تھے۔آپؒ نے ایک تفسیر حضرت ابی بن کعبؓ سے استفادہ کرتے ہوئے مرتب کی تھی۔اسی تفسیر سے امام حاکم نے اپنی مستدرک میں اور امام احمد نے اپنی مسند میں ابوالعالیہ کی روایتیں نقل کی ہیں۔آپؒ کے شاگردوں میں قتادہ جیسے جلیل القدر اہل علم شامل ہیں۔

حضرت قتادہ بن دعامہ السدوسیؒ (متوفی:118ھ): آپؒ پیدائشی طور پر نابینا تھے۔لیکن آپ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا کمال کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔آپ کے استاذ ابن سیرین آپ کے متعلق احفظ الناس کہا کرتے تھے۔خود کہا کرتے تھے کہ میں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی ہوگی جسے میرے حافظہ نے محفوظ نہ کرلیا ہو۔امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ قتادہ تفسیر کے بڑے عالم تھے۔قتادہ کا خود اپنا قول ہے کہ قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت نہیں کہ جس سے متعلق کوئی روایت مجھے معلوم نہ ہو۔علم تفسیر کے علاوہ آپؒ کو عربی زبان وادب اور تاریخ وانساب کے علوم میں بھی گہری مہارت حاصل تھی۔

حضرت زید بن اسلم (متوفی:136ھ): آپؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔آپؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ، حضرت جابر، حضرت انس اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم وغیرہ سے کسب فیض کیا اور ان سے روایات نقل کرتے تھے۔علم تفسیر کا گہرا علم رکھتے تھے اور اس کے مقام بلند پر فائز تھے۔مسجد نبوی ﷺ میں آپؒ کے درس کے حلقے لگتے تھے، جہاں آپؒ تفسیر قرآن عظیم کے تعلیم دیتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں طلبہ ان سے استفادہ کرتے تھے۔آپؒ نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی جسے آپؒ کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم آپؒ سے روایت کرتے تھے۔آپؒ تمام محدثین کے نزدیک قابل اعتماد اور ثقہ راوی کی حیثیت کے حامل تھے۔

حضرت علی بن طلحہ ہاشمی (متوفی:143): آپؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری روایات آپؒ ہی کے ذریعہ سے منقول ہوئی ہیں،حضرت ابن عباسؓ کا یہ تفسیری روایات کا مجموعہ مصر میں لیث بن سعد کے کاتب ابوصالح کے پاس موجود تھا۔تفسیری روایات کا یہ مجموعہ محدثین اور اہل علم کے نزدیک بہت معتبر اور مستند مانا جاتا ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مصر میں تفسیری روایات کا وہ مجموعہ موجود ہے جسے علی بن طلبہؒ نے روایت کی ہے،اور اگر کوئی شخص محض اس کتاب سے استفادہ کی غرض سے مصر تک کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔امام بخاریؒ اور امام ابن جریر طبری نے اسی تفسیری مجموعہ سے حضرت علی بن طلبہؒ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ کی تفسیری روایات اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔

حضرت ابوالقاسم ضحاک بن مزاحم الہلالی (متوفی:102ھ): آپؒ اصلاً خراسان کے رہنے والے تھے۔انہوں نے مشہور مفسر تابعی حضرت سعید بن جبیر سے علم حاصل کیا تھا۔اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور مفسر قرآن تھے،امام احمد بن حنبل نے بھی ان کی تفسیری روایات کو معتبر قرار دیا ہے۔ضحاک بن مزاحم کا اپنا ایک مستقل مدرسہ تھا جہاں آپ تفسیر قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔اس مدرسہ میں ایک وقت میں طلبہ کی تعداد تین تین ہزار تک ہوتی تھی۔چنانچہ آپ درس کے دوران اور دوسرے اوقات میں طلبہ کی نگرانی کے لئے گدھے کی پشت پر سوار ہو جایا کرتے تھے تاکہ اونچائی سے آپؒ کی آواز دور تک پہنچے۔آپؒ نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔

حضرت مقاتل بن سلیمان (متوفی:150ھ): آپؒ نے ایک تفسیر لکھی تھی،جس کے حوالے اکثر تفسیر کی کتابوں میں ملتے ہیں۔اس تفسیر میں آپؒ نے توراۃ اور انجیل کی تعلیمات کو قرآنی تعلیمات سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔اکثر محدثین اور اصحاب جرح وتعدیل کے نزدیک آپؒ کی روایتیں نا قابل اعتبار ہیں،صرف چند اصحاب ایسے ہیں جو آپؒ کی روایتوں کو قابل اعتبار مانتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود مفسرین آپؒ کے اقوال اپنی کتابوں میں بکثرت نقل کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ آپؒ نے اپنی زندگی کا میدان عمل تفسیر کو ہی بنایا تھا، لہٰذا اس باب میں آپؒ کا دائرہ معلومات بہت وسیع تھا۔لہٰذا اگرچہ روایت حدیث کی رو سے محدثین نے آپؒ کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اگر ان کے حوالہ سے لغت وادب،تاریخ وقصص،کتب سابقہ اور عام معلومات سے متعلق کوئی بات نقل کی جائے تو وہ قابل قبول ہوگی۔

10.5.2 عہد تابعین کی بعض تفسیریں:

اوپر گذر چکا ہے کہ اس دور میں تفسیر پر کتابیں وجود میں آنی شروع ہوگئی تھیں۔اس سلسلہ کی پہلی بڑی کوشش حضرت سعید بن جبیر (متوفی:95ھ) نے کی تھی۔دراصل اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (متوفی:86ھ) نے آپؒ سے فرمائش کی تھی کہ آپؒ اس کے لئے قرآن کریم کی ایک تفسیر تحریر فرمادیں۔چنانچہ انہوں نے حکم کی تعمیل میں تفسیر تحریر کی،اور عبدالملک بن مروان کی خدمت میں پیش کردی۔خلیفہ عبد الملک نے اسے شاہی کتب خانہ میں رکھوادیا تھا۔پھر بعد میں یہ تفسیر حضرت عطاء بن دینار (متوفی:126ھ) کو مل گئی تھی،اور انھیں کے نام سے مشہور ہوئی۔حضرت ابوہریرہؓ کے مشہور شاگرد ہمام بن منبہؒ نے احادیث پر مشتمل ایک کتاب ''بدءالخلق'' کے نام سے لکھی تھی۔اس کتاب کے اخیر میں انہوں نے بعض آیتوں کی تفسیر بھی لکھی تھی۔امام مجاہد (متوفی:104ھ) جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لائق شاگرد تھے،انہوں نے بھی ایک تفسیر مدون کی تھی۔کہا جاتا ہے کہ یہ تفسیر مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے۔حضرت ابوالعالیہ ریاحی (متوفی:90ھ) نے ایک تفسیر حضرت ابی بن کعب کی روایات اور اقوال پر مشتمل مرتب کی تھی۔ایک قول کے مطابق یہ دراصل حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی ہی تفسیر تھی۔پھر ابوالعالیہ سے ربیع بن انس نے اور پھر ان کے واسطہ سے ابن ابی حاتم حضرت ابی بن کعب کی تفسیری روایات کو نقل کیا ہے۔ان کے علاوہ اس دور میں جو تفسیریں منصۂ شہود پر آئیں ان میں حضرت اسود بن یزید (متوفی:95ھ) کی تفسیر اسود بن یزید،حضرت ابراہیم نخعی (متوفی:95ھ) کی تفسیر نخعی،حضرت عکرمہ (حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام،متوفی:105ھ) کی تفسیر عکرمہ،حضرت حسن بصری (متوفی:110ھ) کی تفسیر حسن،حضرت امام باقر یعنی امام زین العابدین کے صاحبزادہ (متوفی:112ھ) کی تفسیر امام باقر،حضرت عطاء بن ابی رباح (متوفی:114ھ) کی تفسیر عطاء،حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی (متوفی:117ھ) کی تفسیر قتادہ،حضرت محمد بن کعب قرضی کی (متوفی:120ھ) کی تفسیر قرضی،حضرت اسماعیل بن عبدالرحمٰن سعدی (متوفی:127ھ) کی تفسیر سعدی،حضرت عطاء بن مسلم خراسانی (متوفی:135ھ) کی تفسیر عطاء،شیخ ابونصر محمد بن سائب کوفی (متوفی:146ھ) کی تفسیر کلبی،شیخ شبل بن عباد (متوفی:148ھ) کی تفسیر شبل،

شیخ عبدالملک بن عبدالعزیز اموی معروف ابن جریج (متوفی: 150ھ) کی تفسیر ابن جریج، شیخ مقاتل بن سلیمان بن بشیر الازدی (متوفی: 150ھ) کی تفسیر مقاتل، امام شعبہ بن الحجاج (متوفی: 160ھ) کی تفسیر شعبہ، امام سفیان ثوری (متوفی: 161ھ) کی تفسیر ثوری وغیرہ شامل ہیں۔

10.6 اکتسابی نتائج

- تفسیر قرآن کا آغاز نزول وحی کے ساتھ ہی شروع گیا تھا۔
- جب تک وحی کے نزول کا سلسلہ جاری رہا اور رسول اللہ ﷺ باحیات رہے، قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم کے ذریعہ کی جاتی رہی اور اس کے بعد آنحضور ﷺ کی سنتوں اور حدیثوں کے ذریعہ تفسیر کی گئی۔
- عہد صحابہ میں تفسیر قرآن کی تفسیر، قرآن کریم اور احادیث نبویہ ﷺ سے کرنے کے علاوہ صحابہ کرام نے آپسی مشورہ سے بھی بعض مقامات پر تفسیریں کیں اور بعض انفرادی رائیں بھی سامنے آئیں۔
- عہد تابعین میں قرآن کریم کی تفسیر کے لئے قرآن اور حدیث کے علاوہ آثار صحابہ سے بھی رجوع کیا جانے لگا تھا۔
- تابعین کے دور میں مختلف مقامات نے تفسیر قرآن کے لئے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی جن میں بعض صحابہ کے شاگردوں کے علمی حلقے لگتے تھے اور ان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے، مثلاً مدینہ منورہ میں حضرت ابی بن کعبؓ، مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علیؓ کے شاگردوں کے حلقے سرگرم عمل تھے۔

10.7 نمونۂ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی سوالات:

1- اصول تفسیر کی رو سے قرآن کریم کی تفسیر سب سے پہلے کس کے ذریعہ کی جائے گی؟

(اُ). قرآن کریم (ب). احادیث نبویہ ﷺ (ج). آثار صحابہ (د). اجتہاد

2- مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کرنا چاہئے؟

(اُ). تمام مال واسباب (ب). مال کا آدھا حصہ (ج). ضرورت سے زائد چیزیں (د). مال کا چوتھائی حصہ

3- رسول اللہ ﷺ کی ہر ایک بات اور ہر ایک عمل قرآنی آیات کی تفسیر ہے؟

(اُ). صحیح (ب). غلط (ج). بسا اوقات (د). جب آپ ﷺ غصہ نہ ہوں

4- ''**الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم**''، اس آیت میں ''**ظلم**'' سے کیا مراد ہے؟

(اُ). ظلم وزیادتی (ب). گناہ (ج). شرک (د). قتل وغارت

5- ''**الصحیفة الصادقة**'' کس صحابی رسول کی مرتب کردہ حدیث کی کتاب ہے؟

(اُ). حضرت ابوہریرہؓ (ب). حضرت علی مرتضیٰؓ (ج). حضرت عمرو بن العاصؓ (د). حضرت زید بن ثابتؓ

6- خلفائے راشدین میں سے سب سے زیادہ تفسیری روایات کن سے منقول ہیں؟

(اُ). حضرت ابوبکرؓ صدیق (ب). حضرت عمر فاروقؓ (ج). حضرت عثمان غنیؓ (د). حضرت علی مرتضیٰؓ

7- علاقوں کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری روایات کو کہاں رواج حاصل ہوا تھا؟

(اُ). مکہ مکرمہ (ب). مدینہ منورہ (ج). کوفہ (د). مصر

8- میراث سے متعلق مسائل میں کس صحابی کو اختصاص حاصل تھا؟

(اُ). حضرت علی مرتضیٰؓ (ب). حضرت زیدؓ (ج). حضرت ابی بن کعبؓ (د). حضرت معاذ بن جبلؓ

9- عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر درج ذیل میں سے کس نے تفسیر لکھی تھی؟

(اُ). مجاہد بن جبیر (ب). طاؤس بن کیسان (ج). زید بن اسلم (د). سعید بن جبیر

10- درج ذیل میں سے کون حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں میں سے نہیں ہیں؟

(اُ). مجاہد بن جبیر (ب). سعید بن جبیر (ج). ابراہیم نخعی (د). عکرمہ

10.7.2 مختصر جوابی سوالات:

1- تفسیر بذریعہ قرآن کا کیا مطلب ہے؟ مثالوں کے ساتھ واضح کیجئے۔

2- رسول اللہ ﷺ کی ہر ایک بات اور ہر ایک عمل قرآن کریم کی تفسیر کیسے ہے؟ مثالوں کے ساتھ لکھئے۔

3- حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے عہد صحابہ کی تفسیروں پر روشنی ڈالئے۔

4- کسی تین تابعی مفسر کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

5- عہد تابعین کے تفسیری سرمایہ پر اختصار کے ساتھ ایک نوٹ لکھئے۔

10.7.3 طویل جوابی سوالات:

1- عہد نبوی ﷺ میں تفسیر قرآن کریم کی کیا صورت حال تھی؟ تجزیاتی نوٹ لکھئے۔

2- عہد صحابہ کے مفسرین اور ان کی تفسیری خدمات پر ایک مضمون لکھئے۔

3- عہد تابعین میں تفسیر قرآن کے لئے تابعین عظام کی کوششوں روشنی ڈالئے۔

10.8 تجویز کردہ کتابیں

1- تاریخ التفسیر : ڈاکٹر عبدالصمد صارم ازہری

2- تذکرۃ المفسرین : قاضی محمد زاہد حسینی

3- علوم القرآن : مولانا گوہر رحمٰن

4- علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی

5- تاریخ تفسیر و مفسرین : پروفیسر غلام احمد حریری

6- الاتقان فی علوم القرآن : علامہ جلال الدین سیوطی (اُردو ترجمہ)

7- تاریخ تفسیر و اصول تفسیر : پروفیسر میاں منظور احمد

8- علوم القرآن : ڈاکٹر صبحی صالح (اُردو ترجمہ)

اکائی 11 : تفسیر کی تاریخ (حصہ دوم)

اکائی کے اجزاء

11.1 تمہید

11.2 مقصد

11.3 تفسیر کے تدوینی مراحل

11.3.1 تدوین تفسیر کا پہلا مرحلہ

11.3.2 تدوین تفسیر کا دوسرا مرحلہ

11.3.2.1 تفسیر قرآن کریم میں اسرائیلی روایات کا عمل دخل اور ان کا حکم

11.3.2.2 تفسیر بالماثور کی بعض ابتدائی تفسیریں

11.3.3 تدوین تفسیر کا تیسرا مرحلہ

11.3.3.1 تفسیر بالرائے کی بعض ابتدائی تفسیریں

11.4 برصغیر ہندو پاک میں تفسیر قرآن کریم

11.5 علم قرأت

11.6 علوم القرآن

11.7 اکتسابی نتائج

11.8 نمونہ امتحانی سوالات

11.8.1 معروضی سوالات

11.8.2 مختصر جوابی سوالات

11.8.3 طویل جوابی سوالات

11.9 تجویز کردہ کتابیں

11.1 تمہید

اس اکائی میں تفسیر قرآن کریم کے تدوینی مرحلوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس کے مختلف مراحل میں تدوینی صورت حال سے بحث

کرتے ہوئے تفسیر میں بے سند اقوال و آراء کے در آنے کی وجوہات پر گفتگو کی جائے گی، ساتھ ہی تفسیر میں اسرائیلی روایات کی وقعت کو اجاگر کیا جائے گا، اور اس کی معتبر اور نا قابل اعتبار روایات کا جائزہ لیا جائے گا۔ برصغیر پاک و ہند میں تفسیر کی تاریخ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔ اور تفسیر کے ضمن میں وجود میں آنے والے علوم میں سے بعض کا اجمالاً تعارف پیش کیا جائے گا۔

11.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد تفسیر کے تدوینی مراحل سے واقفیت حاصل کرنی ہے۔ ساتھ ہی برصغیر ہند و پاک میں تفسیر کے آغاز و ارتقاء سے بھی واقف ہونا ہے۔ اس تدوین و تاریخ کے ضمن میں تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے، اسرائیلی روایات، علوم القرآن اور علم قرأت سے بھی آگاہی حاصل ہوگی۔ اور اس سلسلہ کی تفسیری کاوشوں کا تعارف پیش کرنا بھی ہے۔

11.3 تفسیر کے تدوینی مراحل

اس اکائی سے پہلے آپ نے پڑھا کہ عہد نبوی ﷺ اور اس کے بعد عہد صحابہ اور پھر تابعین کے دور میں تفسیر کی کیا صورت حال تھی۔ آپ نے ان ادوار میں تفسیر قرآن کریم کے مآخذ کو بھی جانا۔ ساتھ ہی آپ نے ان ادوار کے اہم مفسرین سے بھی واقفیت حاصل کی۔ عہد تابعین کے بعد تفسیر قرآن کریم نے مزید ارتقائی منزلیں طے کیں، اور اس دور سے تفسیر قرآن کریم کی باقاعدہ تدوین کا آغاز ہوا، اور اس نے بتدریج ترقی اختیار کی۔ اسے ہم مختلف مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ذیل میں ان پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جارہی ہے۔

11.3.1 تدوین تفسیر کا پہلا مرحلہ

تدوین تفسیر قرآن کریم کے اس مرحلہ کا آغاز اس وقت ہوا جب احادیث نبویہ ﷺ کی تدوین کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور ان کو مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا جانے لگا تھا۔ ان مجموعوں میں احادیث کو مختلف ابواب کے تحت موضوعات کے اعتبار سے جمع کیا جاتا تھا۔ تدوین تفسیر کے اس شروعاتی مرحلہ میں قرآن کریم کی تفسیر میں آنحضور ﷺ سے منقول روایتوں کو حدیث کی ان کتابوں میں مستقل ابواب کے تحت کتاب التفسیر یا ابواب التفسیر کے نام سے ایک جگہ جمع کیا جانے لگا تھا۔ اس کی مثالیں بعد کے ادوار میں مرتب کی گئی حدیث کے مجموعوں میں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ اس دور میں جن افراد نے حدیث کی تلاش و جستجو کی اور مختلف علاقوں کے اسفار کئے اور دیگر احادیث کے ساتھ تفسیری روایات کو بھی اپنے پاس محفوظ کیا ان میں یزید بن ہارون السلمی (م:117ھ)، شعبہ بن حجاج (م:118ھ)، اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی (م:127ھ) عطاء الخراسانی (م:135ھ)، ابونصر محمد بن سائب کلبی (م:146ھ)، سفیان ثوری (م:161ھ)، وکیع بن الجراح (م:197ھ)، سفیان بن عیینہ (م:198ھ)، یحییٰ بن سعید القطان (م:198ھ)، روح بن عبادہ بصری (م:205ھ)، عبدالرزاق بن ہمام (م:211ھ) آدم بن ابی ایاس (م:220ھ)، اسحاق بن راہویہ (م:238ھ) اور عبد بن حمید (م:249ھ) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تاہم اس دور میں ہمیں بعض ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ تفسیر کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر یہ سوال قائم ہوا کہ قرآن کریم کا پہلا مفسر کون ہے جس نے مکمل قرآن کریم کی تفسیر آیتوں اور سورتوں کی ترتیب کے ساتھ انجام دی۔ تدوین تفسیر کے اِس پہلے مرحلہ میں بھی اگرچہ اس طرز پر قرآن کریم کی تفسیر کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی بعض مثالیں شروع ہی سے ملتی ہیں۔ عہد خلافت بنوامیہ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان (م:86ھ) نے حضرت سعید بن جبیرؒ (م:95ھ) کو حکم دیا تھا کہ آپؒ مکمل قرآن کریم کی ایک

تفسیر اس کے لئے لکھ دیں۔ چنانچہ حضرت سعید بن جبیر نے حکم کی تعمیل میں مکمل قرآن کریم کی تفسیر میں ایک کتاب تحریر کر دی تھی جسے عبدالملک بن مروان نے اپنی شاہی لائبریری کی زینت بنایا تھا۔ چونکہ عبدالملک بن مروان کا انتقال 86 ہجری میں ہو گیا تھا، لہٰذا یہ بات ناگزیر ہے کہ یہ تفسیر 86 ہجری سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ پھر بعد میں حضرت سعید بن جبیرؒ کے ایک لائق شاگرد عطاء بن دینار (م:126ھ) نے یہ تفسیر کوشش کر کے حاصل کر لی تھی، اور اس سے تفسیری اقوال و آراء نقل کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگرد امام مجاہد (م:103ھ) کے متعلق ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ وہ حضرت ابن عباسؓ کے درس میں جب شریک ہوتے تو اپنے ہمراہ تختیاں بھی لیتے جاتے تھے، جن پر حضرت ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال و آراء اور روایات تحریری طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔ بسا اوقات وہ حضرت ابن عباسؓ سے بعض آیتوں کی تفسیر دریافت بھی کرتے تھے، اور جب آپؓ ان کی تفسیر بیان کرتے تو انھیں ضبط تحریر میں لے آتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے خود فرمایا تھا کہ لکھتے جاؤ۔ یہاں تک پورے قرآن کریم کی تفسیر امام مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ کی شاگردی میں اپنے پاس جمع کر لی تھی۔

ابن الندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں فراء نحوی (م:207ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ابوالعباس ثعلب (م:291ھ) کی خواہش پر ایک تفسیر ''معانی القرآن'' کے نام سے املاء کرائی تھی۔ اس کی پہلی جلد 1956ء میں قاہرہ کے ایک ناشر دارالکتاب سے شائع ہوئی تھی، جو سورہ یونس تک کی تفسیر پر محیط تھی۔ ان تفاسیر کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہمام بن منبہ نے ایک کتاب ''بدء الخلق'' کے نام سے لکھی تھی جس میں قرآن کریم کی بعض آیتوں کی تفسیر بھی بیان کی تھی۔ محمد بن کعب القرضیؒ کے متعلق منقول ہے کہ انہوں نے بھی تفسیر پر ایک کتاب لکھی تھی۔ عمرو بن عبید معتزلی کے متعلق بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ اس نے حضرت حسن بصریؒ کی روایت سے ایک تفسیر مرتب کی تھی۔ ابن جریج نے تین ضخیم جلدوں میں ایک تفسیر تیار کی تھی جسے بعد میں محمد بن ثور نے روایت کی تھی۔ ان مفسرین کے علاوہ ابوفید مورج نے غرائب القرآن پر، امام کسائی نحوی نے قرآن کریم کے متشابہات پر اور امام شافعی نے قرآن کریم کے احکام سے متعلق آیات پر کتابیں لکھی تھیں، جو بعد میں تفسیر قرآن کریم کی باقاعدہ تدوین و ترتیب کے وقت بنیاد ثابت ہوئیں۔

11.3.2 تدوین تفسیر کا دوسرا مرحلہ

تفسیر کے اس تدوینی مرحلہ میں تفسیر قرآن کے لئے کتابیں لکھے جانے کا مستقل طور پر آغاز ہوا۔ اس سے پہلے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے مروی احادیث کو کتب احادیث میں کتاب التفسیر اور ابواب التفسیر کے ناموں سے معنون ابواب کے تحت جمع کیا جاتا تھا۔ لیکن تدوین تفسیر کے اس مرحلہ میں ان روایات اور آثار صحابہ و تابعین کو ایک کتاب میں آیات قرآنیہ کے ذیل میں ذکر کئے جانے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

جب کتابی شکل میں تفسیر کی تدوین کا آغاز ہوا تو اس تدوینی دور کی شروعات میں تفسیری روایات اور دیگر اقوال و آراء کو سند کے ساتھ نقل کیا جاتا تھا۔ اس طرز پر کئی مفسرین نے اپنی تفسیریں مرتب کیں، جن میں ایک معروف نام ابن راہویہ (م:238ھ) کا ہے، کہ وہ قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اپنے اساتذہ و شیوخ کے اقوال سند کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ یہی طرز مشہور مفسر حسین بن مسعودی جو بغوی کے نام سے معروف ہیں نے اپنے تفسیر ''معالم التنزیل'' میں اختیار کیا۔ امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اقوال نقل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی چند مثالیں نیچے دی جا رہی ہیں:

☆ بغوی ←ا ابواسحاق ←ا محمد بن عبداللہ ←ا احمد بن محمد ←ا عثمان بن سعید ←ا عبداللہ بن صالح ←ا معاویہ بن صالح ←ا علی بن ابی طلحہ ←ا عبداللہ بن عباسؓ

☆ بغوی ←ا ابومحمد عبداللہ بن حامد ←ا ابن بطہ ←ا عبداللہ بن محمد بن زکریا ←ا سعید بن یحییٰ ←ا مسلم بن خالد ←ا مجاہد

☆ بغوی ←ا ابوالقاسم ←ا حسن بن محمد ←ا احمد بن یٰس ←ا ابوبکر محمد بن بکر بن سہل ←ا عبدالغنی بن سعید الثقفی ←ا ابومحمد موسیٰ بن عبدالرحمٰن ابن جریج ←ا عطاء بن ابی رباح

☆ بغوی ←ا ابوالقاسم الحسن بن محمد ←ا سعید بن محمد ←ا منہل بن واصل ←ا ابوصالح عمرو بن عبید ←ا حسن بصری

☆ بغوی ←ا ابومحمد عبداللہ بن حامد الاصفہانی ←ا حامد بن محمد الہروی ←ا ابویعقوب الہروی ←ا ابومحمد حسین بن محمد مروزی ←ا شبان بن عبد الرحمٰن ←ا قتادہ

☆ بغوی ←ا ابوالقاسم الحسن بن محمد ←ا ابوعمر احمد السرخسی ←ا ابوالحسن احمد بن اسحاق ←ا ابوعلی الحسن بن محمد ←ا موسیٰ بن عمار ←ا عبیداللہ بن ابی جعفر ←ا ابوجعفر ربیع ←ا انس ←ا ابی العالیہ

یعنی امام بغوی جب کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں جو روایات نقل کرتے ہیں انھیں مختلف واسطوں سے آنحضرت ﷺ تک پہنچاتے ہیں۔لیکن اس تدوینی مرحلہ کے شروعاتی دور کے بعد بہت جلد ہی یہ فرق رونما ہوا کہ تفسیری روایات کی اسناد کو مختصر کیا جانے لگا،اوراصل زورحدیث میں مذکورتفسیری اقوال پر دیا جانے لگا۔اسی طریقہ سے دیگر اقوال صحابہ وتابعین اوران کی آراءکو یا تو مختصر سند کے ساتھ یا بلا سند تحریر کیا جانے لگا۔

اسی دور میں مختلف وجوہات کی بنا پر بطور تفسیری اقوال وروایات بہت سی بے سند باتیں تفسیر قرآن کریم میں شامل ہونے لگیں۔جن وجوہات کے پیش نظر یہ باتیں سامنے آئیں ان میں سے بعض اہم وجوہات پر ذیل میں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

گروہی تعصب: تفسیری اقوال گڑھنے کا آغاز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت کے آخری دور سے ہوتا ہے۔اسی دور میں مختلف گروہ وجود میں آئے۔انہوں نے حتی المقدور اپنے افکار ونظریات کو قرآن وحدیث اور صحابہ کرام کے اقوال سے ثابت کرنے کی کوشش کی،اور اس سلسلہ میں اپنی بات مضبوط اور باوزن بنانے کے لئے انہوں نے اپنے حق میں بہت سی ایسی باتیں محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی جانب منسوب کر کے عوام میں مشہور کرنی شروع کی جن کا دراصل حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ظاہر ہے کہ اگر وہ ان باتوں کو خود اپنی جانب منسوب کرتے تو ان کے عقائد ونظریات کو اس بڑے پیمانہ پر رواج وشہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوتی جس کے وہ متوقع تھے۔اس کے برعکس انہوں نے یہ باتیں آقا تاجدار مدینہ حضرت محمد ﷺ کی جانب منسوب کیا،تاکہ ان کے افکار ونظریات کی اشاعت اور مقبولیت کے سلسلہ میں وہ جن نتائج کی امید رکھتے ہیں وہ انھیں آسانی سے ساتھ حاصل ہو جائیں۔یہ چیز تفسیری روایات گڑھنے کی ایک وجہ بنی۔

سیاسی برتری: حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کے زمانہ میں یہ وجہ بھی پیش آئی اوراس کے بعد یہ سلسلہ زور پکڑتا گیا۔حضرت علیؓ کے دور میں بہت سے سیاسی اتار چڑھاؤ پیش آئے۔اسی زمانہ میں خوارج وشیعیان علی کا مقابلہ ہوا،جنگ جمل اور جنگ صفین کا واقعہ پیش آیا،فرقہ بنوسبا نے بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کے درمیان افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا۔ان کے علاوہ خلافت بنوامیہ اور خلافت بنوعباس کے قیام کے دوران

بہت سے تفسیری اقوال گڑھے گئے تا کہ سیاسی طور پر ایک دوسرے سے برتری حاصل کی جا سکے۔

جذبہ انتقام: جب دشمنان اسلام نے خود اپنے آپ میں اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ مسلمانوں کو میدان جنگ میں اور دلائل کی بنیاد پر شکست نہیں دے سکتے تو انہوں نے جھوٹ کا لبادہ اوڑھ لیا کہ وہ بظاہر مسلمان ہو جائیں گے، اور دل سے اپنے سابقہ مذہب سے وابستہ رہیں گے، اور اس طریقہ سے وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے بہت سی من گھڑنت باتیں جن کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا مسلمانوں میں پھیلایا، اور چونکہ ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ وتابعین کی جانب ہوتی تھی اس لئے آسانی کے ساتھ ان کو مقبولیت بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں میں بے سند باتوں کے رواج پا جانے کی ایک وجہ یہ بھی بنی۔

حالانکہ بعد میں مفسرین نے اسناد کی تحقیق کی بنیادی پر ان تمام بے سند اور گڑھی ہوئی تفسیر روایات واقوال کو نا قابل اعتبار قرار دیا۔

11.3.2.1 تفسیر قرآن کریم میں اسرائیلی روایات کا عمل دخل اور ان کا حکم:

اوپر گزر چکا ہے کہ اس سے پہلے قرآنی آیات سے متعلق تفسیری روایات کو سند کے ساتھ نقل کئے جانے کا اہتمام ہوتا تھا۔ بعد میں باوجودیکہ بہت سی بے سند باتیں تفسیری روایات میں شامل ہو گئی تھیں، اس دور میں جو بھی تفسیریں مرتب ہوئیں وہ ''تفسیر بالماثور'' کے تحت منظر عام پر آئیں، یعنی یہ ساری تفاسیر خود قرآن کریم، احادیث نبویہ ﷺ اور صحابہ وتابعین کے اقوال وآراء کی روشنی میں مرتب ہوئیں۔ البتہ ان میں تفسیر کرتے ہوئے اسرائیلی روایات (سابقہ آسمانی کتابیں) کا بھی کافی عمل دخل رہا۔ قرآن کریم میں بہت سے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جو اسرائیلی روایات میں پہلے سے موجود تھے خاص طور پر سابقہ انبیاء اور اقوام وملل کے حالات وواقعات کا تذکرہ قرآن کریم کے مقابلہ زیادہ تفصیل سے ان میں موجود ہے۔ ظاہر ہے اس دور میں دیگر اقوام کے ساتھ یہود ونصاریٰ بھی بڑی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے جن میں بہت سے اپنے سابقہ مذہبی کتابوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور اس میں انھیں وہ احکام وواقعات ملتے جو انہوں نے پہلے پڑھی ہوئی ہوتی تھی تو لازماً اس کی تشریح وتفسیر میں وہ ان مذہبی کتابوں کا تذکرہ کر دیتے تھے۔ اس طریقہ سے اسرائیلی روایات کا عمل دخل کا آغاز ہوا، جو بتدریج مضبوطی اختیار کرتا گیا۔ پھر بسا اوقات مفسرین بعض قرآنی آیات کی تفصیل جاننے کی غرض سے اسرائیلی روایات سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی اسرائیلی روایات قرآن کریم کی تفسیر میں داخل ہو گئیں۔

چنانچہ مفسرین نے اسرائیلی روایات کو معتبر اور نا قابل اعتبار ہونے کی بنیاد پر تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی قسم کی اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کی تائید خود قرآن کریم میں موجود ہو یا جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمادی ہے، مثلاً قرآن کریم میں حضرت موسیٰ کے واقعہ میں آپؑ کے جس رفیق کا تذکرہ کیا گیا ہے، حدیث نبوی ﷺ میں ان کا نام حضرت خضر بتایا گیا ہے، جس سے اسرائیلی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ تو اسرائیلی روایات کی یہ قسم قابل اعتبار اور قابل قبول ہوں گی۔ دوسری قسم کی اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کی قرآن کریم یا رسول اللہ ﷺ نے تردید کر دی ہو، مثلاً یہ اسرائیلی روایت کہ حضرت سلیمانؑ اپنی آخری عمر میں بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ اسرائیلی روایت بہر حال نا قابل اعتبار ہے کیونکہ قرآن مجید میں بالکل واضح طور پر اس کی تردید کی گئی ہے۔ اسرائیلی روایات کی تیسری قسم میں وہ روایات داخل ہوں گی جن کے متعلق کتاب وسنت خاموش ہیں، جن کے متعلق صراحتاً ہمیں کچھ معلوم نہیں مثلاً تورات میں مذکور تعلیمات۔ چونکہ تورات کی ان تعلیمات کے متعلق یقینی طور پر نہیں معلوم کہ یہ صحیح ہیں یا غلط ان کے متعلق خاموشی اختیار کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا ہے: نہ تم ان کی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب، اور کہئے کہ ہم نے اللہ اور جو کچھ ہماری جانب اتارا گیا ہے ان پر ایمان لایا۔ اسرائیلی روایات کی اس قسم کا تعلق دراصل براہ راست دین

وشریعت سے نہیں ہے، چنانچہ خود اہل کتاب بھی اس سلسلہ میں مختلف الخیال ہیں۔ مثلاً اصحاب کہف کے نام، ان کے کتا کا رنگ، جن پرندوں کو حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے زندہ کیا تھا ان کے نام، حضرت موسیٰ کی لاٹھی کس درخت کی لکڑی سے بنی تھی؟ وغیرہ

11.3.2.2 تفسیر بالماثور کی بعض ابتدائی تفسیریں:

بعد کے ادوار میں بھی اس طرز (تفسیر بالماثور) پر تفسیریں مرتب کی جاتی رہیں، جن میں سے بعض نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ذیل میں چند تفاسیر پیش کی جارہی ہیں:

1- جامع البیان عن تاویل آي القرآن:

امام ابن جریر طبری (م:310) کی یہ تفسیر ''تفسیر طبری'' کے نام سے معروف ہے۔ امام ابن جریر طبری اصلاً طبرستان کے باسی تھے۔ کم عمری ہی میں طلب علم کی خاطر اپنے وطن اور گھر بار کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ آپؒ نے حصول علم کے لئے مختلف علاقوں مصر، شام اور عراق وغیرہ کے اسفار کئے، اور بالآخر بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ امام ابن جریر طبری کو مفسرین کے نزدیک بہت بلند مقام حاصل ہے۔ آپ کی تفسیر کو تفسیر بالماثور کا اولین مصدر اور ماخذ شمار کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی تفسیر بالرائے میں بھی اس تفسیر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ امام طبری کسی بھی قرآنی آیت میں منقول روایات واقوال کو بیان کرنے کے بعد ان کی درجہ بندی اور توجیہ کرتے ہیں، اور اس کی تائید میں صحابہ وتابعین کے اقوال سے دلیل دیتے ہیں، البتہ ان کی اسناد پر کوئی کلام نہیں کرتے۔ پھر ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں، ان سے مستنبط ہونے والے احکام کی بھی تشریح وتوضیح کرتے ہیں اور اگر کہیں عربی گرامر کی رو سے الفاظ ومعانی کی تشریح کی ضرورت ہو تو اس کی بھی مکمل طور پر صراحت کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت کے سلسلہ میں جو مختلف قرأتیں منقول ہیں ان کا بھی تذکرہ کرتے ہیں، اور ان کی بنیاد پر قرآنی آیات کے معانی ومطالب کی توضیح کرتے ہیں۔ اگر کسی قرأت کی رو سے کسی آیت کا ایسا معنیٰ پیدا ہو رہا ہو جو احکام الٰہی کے مزاج کے خلاف ہو تو اس کی تردید کر دیتے ہیں۔ یہ تفسیر تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

2- تفسیر بحر العلوم:

زیر نظر تفسیر ابو اللیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی (م:373ھ) کی مرتب کردہ ہے، جو تفسیر ابو اللیث سمرقندی کے طور پر معروف ہے۔ امام سمرقندی نے اپنی اس تفسیر کے شروع میں ایک مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں علماء متقدمین کی روایات کی روشنی میں علم تفسیر کی اہمیت وفضیلت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ جسے عربی زبان وادب اور اسباب نزول وغیرہ کا اچھی طرح علم نہ ہو اس کے لئے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنا ناجائز ہے۔ امام سمرقندی جب کسی آیت کی تفسیر میں روایتیں نقل کرتے ہیں تو اس میں پوری سند ذکر کرنے کا التزام نہیں کرتے، بلکہ اختصار کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ وہ ان کی اسناد پر بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتے اور نہ ہی امام طبری کی طرح ان کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں، بسا اوقات ضعیف روایتوں کو بھی نقل کر دیتے ہیں۔ البتہ اس کی مختلف قرأتوں کا تذکرہ کرتے اور ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض مقامات پر اسرائیلی روایات لے آتے ہیں اور ان پر کوئی تنقید وتجزیہ نہیں کرتے۔ یہ تفسیر تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔ شیخ زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی (م:854ھ) نے اس کی احادیث کی تخریج کی ہے۔

3- الکشف والبیان عن تفسیر القرآن:

یہ تفسیر ''تفسیر ثعلبی'' کے بطور معروف ہے، جسے ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیساپوری (م:427) نے مرتب کیا ہے۔ امام ثعلبی نے

اس تفسیر کو سو سے زائد کتابوں سے استفادہ کر کے لکھا ہے، مختصر تعلیقات اور اجزاء اس کے علاوہ ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ انہوں نے جن تین سو سے زائد اساتذہ وشیوخ سے کسب فیض کیا تھا انھیں بھی حسن ترتیب کے ساتھ اس میں جمع کر دیا ہے۔ انہوں نے کتاب کے شروع میں دو ابواب لکھے ہیں جن میں سے پہلے میں قرآن اور حامل قرآن کی اہمیت وفضیلت پر گفتگو کی ہے اور دوسرے باب میں تفسیر وتاویل کا تعارف مختلف دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے، اس کے بعد اصل قرآن کریم کی تفسیر کا آغاز کیا ہے۔ آپ نے جن اساتذہ اور شیوخ سے تفسیری روایات لئے ہیں ان کے نام اپنی تفسیر کے شروع میں ذکر کر دیئے ہیں، لہٰذا جب قرآنی آیات کی تفسیر کے دوران کوئی روایت نقل کرتے ہیں تو ان کی اسناد کو حذف کر دیتے ہیں، البتہ جب آپ اپنے کسی معاصر کی کوئی بات نقل کرتے ہیں تو اس کی سند بیان کر دیتے ہیں۔ چونکہ امام ثعلبی کی اصل دلچسپی کا موضوع نحو تھا اس لئے تفسیر کے دوران نحوی اصول وقواعد پر پوری تفصیل کے ساتھ وضاحت پیش کرتے ہیں۔ مشکل الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے عربی اشعار سے بھی مدد لیتے ہیں اور قاری کے سامنے اسے آسان تر بنا کے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فقہی احکام ومسائل پر بھی گفتگو کرتے ہوئے مختلف مسالک کے موافق ومخالف دلائل کی توضیح کرتے ہیں۔ چنانچہ وراثت سے متعلق مسئلہ پر آپ نے بہت مفصل گفتگو کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اسرائیلی روایات کا تذکرہ بڑے پیمانہ پر کیا ہے، اور اس کے صحیح وسقیم ہونے پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔

4-معالم التنزیل:

یہ تفسیر ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی (م:510ھ) کی مرتب کردہ ہے، جو ''تفسیر بغوی'' کے نام سے معروف ہے۔ یہ تفسیر بالماثور کی اہم تفسیر شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس میں امام بغوی نے قرآنی آیات کی تفسیر میں صرف صحیح اور مستند روایات کو نقل کرنے کا التزام کیا ہے۔ پروفیسر غلام احمد حریری، کشف الظنون کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ معالم التنزیل تفسیر کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس میں صرف صحیح تفسیری روایات کے ذریعہ آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے اور ان سے مستنبط ہونے والے احکام شرعیہ پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں بے سند باتیں اور واقعات ذکر کرنے سے مکمل طور پر احتراز کیا گیا ہے۔ البتہ امام ثعلبی کی طرح امام بغوی نے بھی اپنے تمام اساتذہ اور شیوخ کا تذکرہ کتاب کے شروع میں کر دیا ہے جن سے انہوں نے تفسیری روایات حاصل کی ہیں بلکہ پوری سند کا تذکرہ کر دیا ہے، چنانچہ بعد میں جب کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو پوری سند بیان نہیں کرتے، بلکہ صرف یہ کہنے پر اکتفاء کرتے ہیں: **قال ابن عباس کذا و کذا، وقال مجاهد کذا و کذا**۔ ہاں اگر کوئی ایسی روایت ذکر کرتے ہیں جس کی سند انہوں نے کتاب کے شروع میں ذکر نہیں کی ہو تو بالضرور ایسی روایت کے ساتھ ہی سند بھی بیان کر دیتے ہیں، بلکہ اس کے راویوں کے ثقہ اور عدم ثقہ ہونے پر بھی کلام کرتے ہیں۔ بقدر ضرورت نحوی مسائل پر بھی بحث کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اسرائیلی روایات بھی نقل کرتے ہیں۔ اس تفسیر کا اختصار شیخ تاج الدین ابو نصر عبدالوہاب بن محمد حسینی (م:875ھ) نے تیار کیا ہے۔

5-المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز:

یہ ابن عطیہ کی مرتب کردہ تفسیر ہے۔ ابن عطیہ کا پورا نام ''ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی'' (م:546ھ) ہے۔ یہ اندلس میں قضائت کی فریضہ پر مامور تھے۔ ابن عطیہ کی یہ تفسیر مفسرین کے نزدیک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر غلام احمد حریری نے اپنی کتاب تاریخ تفسیر ومفسرین میں ابو حیان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے بھی تفاسیر قرآن مرتب کی ہیں ان سب میں ابن عطیہ کا مقام بلند تر ہے۔ اور ابن خلدون کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ مولف نے اس کو جملہ تفاسیر سے ملخص کیا، اور اس میں صرف صحیح مواد کو جگہ دی ہے۔ یہ کتاب دیار مغرب واندلس میں نہایت مقبول ومستحسن خیال کی جاتی ہے۔ (ص:218) اس تفسیر میں ابن عطیہ کا طرز تفسیر یہ رہا ہے کہ پہلے قرآنی آیت

لاتے ہیں اس کے بعد نہایت آسان اور سلیس زبان میں خود اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں، بعد ازاں اس بابت وارد ہونے والی روایات اور آثار نقل کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ وتعبیرات کی تشریح کے لئے اکثر عربی اشعار پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ عربی گرامر کو بھی بکثرت زیر بحث لاتے ہیں، ساتھ ہی قرآن کریم کی مختلف قرأتوں پر بھی گفتگو کرتے ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے جداگانہ معانی ومطالب کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ یہ تفسیر دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

6-تفسیر القرآن العظیم:

یہ ''تفسیر ابن کثیر'' کے نام سے معروف ہے۔ حافظ ابن کثیر کا پورا نام ''عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمرو بن کثیر'' (م:774ھ) ہے۔ تفسیر بالماثور پر جن تفاسیر نے شہرت دوام حاصل کیا ان میں تفسیر ابن کثیر کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر اس اعتبار سے نمایاں وصف کی حامل ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اس میں تفسیر بالقرآن کا خاص اہتمام کیا ہے، لہٰذا اگر کسی آیت کی تفسیر قرآن کی کسی دوسری آیت سے ہو رہی ہو تو اسے ضرور ذکر کرتے ہیں۔ جب کسی آیت کی تفسیر قرآن کی دوسری آیتیں نہیں کر رہی ہوتی ہیں تو پھر اس کی تفسیر میں رسول اللہ کی احادیث اور آثار صحابہ نقل کرتے ہیں۔ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ان کی اسانید پر قابل اعتبار اور نا قابل اعتبار ہونے کی بنیاد پر کلام بھی کرتے ہیں۔ اس تفسیر کا ایک دوسرا نمایاں وصف یہ ہے کہ جب اس میں حافظ ابن کثیر کوئی اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں تو ساتھ ہی اس کے صحیح وغلط ہونے پر بھی بحث کرتے ہیں۔ فقہی احکام سے متعلق آیات میں محض احکام کی وضاحت پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ مختلف مسالک کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے دلائل پر بھی گفتگو کرتے ہیں، اور پھر اس کے بعد ان کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ شیخ احمد شاکر نے اس کے اسانید کو حذف کر کے شائع کیا ہے۔

11.3.3 تدوین تفسیر کا تیسرا مرحلہ

تفسیر کے اس تدوینی مرحلہ میں جبکہ تفسیر قرآن کی تدوین کا آغاز ہو چکا تھا اور اس کی ایک بڑی تعداد منظر عام پر آ چکی تھی، اور ساتھ ہی اس نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس دور میں سابقہ طرز تفسیر کے مقابلہ یہ ایک نمایاں فرق رونما ہوا کہ قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے احادیث وآثار کے ساتھ عقل وفہم کو بھی بروئے کار لایا جانے لگا۔ گویا ''تفسیر بالماثور'' کے بعد اب یہاں سے ''تفسیر بالرائے'' کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اس کی بنیادی اور اہم ترین وجہ یہ تھی کہ اس دور میں جب کہ اسلام حدود عرب سے باہر نکل کر اپنی حقانیت کے ڈنکے بجانے لگا تھا اور لوگ بڑی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہوتے جا رہے تھے، اس کے پہلو بہ پہلو غیر اسلامی نظریات بھی اپنی راہ بناتے جا رہے تھے اور اس کی اشاعت کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ فرقہ پرستی، الحاد، انکار حدیث، عقلیت پسندی جیسے فتنوں اور معتزلہ، مرجیہ، قدریہ اور دیگر باطل فرقوں کا اسی دور میں ظہور ہوا تھا اور انہوں نے قرآنی آیات ہی کی آڑ میں اپنے نظریات کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا اس دور کے مفسرین نے تفسیر قرآن کریم کے دوران ان افکار ونظریات کی تردید کو بھی دین کی حفاظت کا طریقہ سمجھا، چنانچہ تفسیر قرآن کریم کے دوران جہاں کسی آیت کی تفسیر دوسری آیات یا احادیث وآثار سے کی جاتی وہیں عقل وفہم کے ذریعہ بھی اس کی تشریح وتوضیح کی کوشش کی جاتی تھی، اور اس کے ساتھ ہی باطل افکار وخیالات کی تردید کی بھی کوششیں کرتے تھے۔ ابوعمرو بن العلاء، امام شعبہ، سفیان ثوری، امام مالک بن انس، یونس بن حبیب، وکیع بن الحراح اور دیگر افراد نے تفسیر کے مخصوص موضوعات پر کتابیں لکھی، اسی طرح محدث سفیان بن عیینہ نے عقل پرستوں کے نظریات کی تردید کے لئے ایک مستقل کتاب ''جوابات القرآن'' کے نام سے لکھی۔ اور پھر بعد میں انھیں عقل پسندوں کی وجہ سے

کلامی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے اور علم کلام کا آغاز ہوا، اور پھر اس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں۔

اسی طرح اسلامی حدود مملکت کی وسعت کے پیش نظر یہ ضرورت بھی پیش آئی کہ اس کے لئے مذہب اسلام کے احکام کو واضح کیا جائے اور اس کی تشریح وتفصیل لوگوں کے سامنے آئے، چنانچہ احکام القرآن پر تفسیریں لکھنے کا آغاز ہوا۔ پھر اسلامی فقہ نے بھی مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس کے مذاہب ومسالک ظاہر ہونے لگے تھے، اس کے ساتھ ہی عربی گرامر (صرف ونحو) اور عربی لغت کی تدوین کا بھی اسی دور میں آغاز ہوا تھا، فلسفہ ومنطق کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ چنانچہ ان سبھی موضوعات کو بنیاد بنا کر تفسیریں مرتب کی جانے لگیں۔ مفسرین عام طور پر اپنے ذاتی رجحان اور اپنی لیاقت کی بنیاد پر ایک یا دو یا اس سے زیادہ موضوعات کو منتخب کر کے اپنی تفسیریں تیار کرتے تھے۔ یہ سب اگرچہ کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کی روشنی ہی میں انجام پاتی تھیں، لیکن چونکہ ان میں عقل وفہم کا عمل دخل نسبتاً زیادہ ہوتا تھا، لہٰذا اس قسم کی تفسیر کو ''تفسیر بالرائے'' کا نام دیا گیا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس طرز پر جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں مصنف کے ذاتی رجحانات کی چھاپ زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بسا اوقات ان تفاسیر میں اس قسم کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں کہ مصنف کسی آیت کی ایک تفسیر بیان کرتا ہے بعد ازاں اس کی تائید وتوثیق میں احادیث وآثار لاتا ہے اور جو احادیث وآثار اس کی بیان کردہ تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتے ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرز تفسیر پر بے شمار تفسیریں لکھی گئیں، جن کو شمار کرپانا محال ہے۔

11.3.3.1 تفسیر بالرائے کی بعض ابتدائی تفسیریں:

ذیل میں تفسیر بالرائے پر لکھی گئی بعض تفاسیر کا تعارف پیش کیا جارہا ہے:

1- مفاتیح الغیب:

یہ امام فخر الرازی کی مرتب کردہ تفسیر ہے۔ امام فخر الدین رازی کا اصل اور پورا نام ابوعبداللہ محمد بن عمر بن حسین (م:606ھ) ہے۔ آپ کو علم تفسیر، کلام، علوم عقلیہ، لغت وغیرہ میں بڑا بلند مقام حاصل تھا۔ آپ نے اس اہم تفسیر کے علاوہ علم کلام کے موضوع پر ''المطالب العالیہ''، فقہ پر ''المحصول فی اصول الفقہ''، فلسفہ پر ''الملخص'' اور دیگر کتابیں تحریر فرمائیں۔ یہ تفسیر ''تفسیر الکبیر'' کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس تفسیر کی کئی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں اور سورتوں کے درمیان ربط وتعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ بسا اوقات اس کی ایک سے زائد مناسبتیں بیان کی گئی ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام رازی چونکہ خود ریاضی، علوم طبیعی اور دیگر علوم جدیدہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے، لہٰذا قرآن کریم کی جو آیتیں ان سے متعلق ہیں ان پر کھل کر بحث کرتے ہیں، اسی طرح الٰہیات سے متعلق مباحث میں عقلی دلائل کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ اسی طرح معتزلہ اور دیگر فرقے جن آیات سے اپنے افکار ونظریات کی تائید کرتے ہیں ان پر شدید گرفت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ احکام سے متعلق آیات میں فقہاء کے مسالک کا ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل کا بھی احاطہ کرتے ہیں اور شافعی مسلک کی تائید میں بکثرت دلائل پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ تفسیر کے دوران عربی گرامر اور بلاغت کے مسائل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود یہ قابل افسوس بات ہے کہ امام رازی اپنی تفسیر کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے کہ آپ کا وصال ہوگیا تھا۔ آپ کے پیچھے کس نے یہ تفسیر مکمل کی، اختلاف اقوال کے ساتھ شیخ نجم الدین احمد بن محمد مکی (م:727ھ) اور شہاب الدین بن خلیل دمشقی (م:639ھ) کے نام اس ضمن میں لئے جاتے ہیں۔

2-انوارالتنزیل واسرارالتاویل:

یہ تفسیر ''تفسیر بیضاوی'' کے نام سے زیادہ جانی جاتی ہے۔اسے ابوالخیر ناصرالدین عبداللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م:691ھ) نے مرتب کیا ہے۔آپ مسلکاً شافعی تھے اور شیراز کے قاضی القضاۃ تھے۔امام بیضاوی نے اپنی اس تفسیر کی تحریر میں بہت دقیق اسلوب اختیار کیا ہے۔اس میں انہوں نے مختلف قرأتوں کا تذکرہ کیا ہے جس میں قرأت متداولہ کے ساتھ قرأت شاذہ کو بھی شامل کرلیا ہے۔نحوی مسائل کو بھی زیر بحث لایا ہے،شافعی مسلک کی تائید کرتے ہوئے فقہی احکام ومسائل کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔افکار ونظریات کے سلسلہ میں اہل السنّت کے نظریات کو ترجیح دیتے ہیں،اور معتزلہ اور دیگر فرقوں کے نزاعی افکار کی تردید کرتے ہیں۔اسرائیلی روایات سے حتی المقدور احتراز کرتے ہیں،اگر کسی مقام پر اس کا تذکرہ کرتے ہیں تو مرجوح قول کے طور پر۔البتہ فلکیات یا امور طبعیہ سے متعلق بحث کو بہت تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

3-مدارک التنزیل وحقائق التاویل:

یہ تفسیر ''تفسیر نسفی'' کے طور پر معروف ہے،اور خود مفسر ابوالبرکات نسفی کے بطور جانے جاتے ہیں،حالانکہ ان کا اصل نام عبداللہ بن احمد بن محمود ہے۔امام نسفی نے اپنی اس تفسیر کو عربی زبان وادب کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے۔انہوں نے اس کے لئے تفسیر بیضاوی اور تفسیر کشاف سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔اس میں عربی زبان وادب کے ساتھ ہی مختلف النوع قرأتوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔امام نسفی چونکہ خود حنفی المسلک تھے اس لئے آیات الاحکام کی تفسیر کے دوران مختلف مسالک کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن متنوع دلائل کی بنیاد پر حنفی مسلک کی تائید اور ترجیح دیتے ہیں۔اس میں اسرئیلی روایات کا تذکرہ بہت کم کیا گیا ہے۔اسرائیلی روایات ذکر کرنے کے ساتھ بسا اوقات امام نسفی اس بابت تحقیقی بات پیش کرتے ہیں یا خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

4-لباب التاویل فی معانی التنزیل:

اس تفسیر کو تفسیر خازن کے نام سے شہرت حاصل ہے۔اس کے مرتب علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم ہیں۔مولف نے اس تفسیر کو مرتب کرنے کے لئے سابقہ تفاسیر سے بھرپور استفادہ کئے ہیں۔جن مقامات پر کوئی روایت یا اثر بیان کرتے ہیں ان کی سند کو حذف کردیا ہے۔مولف نے اپنی اس تفسیر میں آیات احکام کی تفسیر کے دوران مسائل کی خوب وضاحت کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں دلائل کی بڑی تعداد بیان کردیتے ہیں۔البتہ اس تفسیر کی ایک کمی یہ ہے کہ اس میں اسرائیلی روایات بڑی تعداد میں نقل کی گئی ہیں،اور ان کے معتبر اور نا قابل اعتبار ہونے کا کچھ خیال نہیں کیا گیا ہے۔عہد نبوی ﷺ کے غزوات پر بھی بہت تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔اس کے علاوہ مولف نے اس تفسیر کے اندر وعظ ونصیحت سے متعلق روایات واقوال بڑی تعداد میں جمع کردی ہیں۔

5-السراج المنیر :

یہ خطیب محمد بن محمد شربینی (م:977ھ) کی مرتب کردہ تفسیر ہے۔اس تفسیر کے نمایاں اوصاف میں سے یہ ہے کہ مولف نے اس میں صرف صحیح روایتیں ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے،اگر کسی جگہ سنداً ضعیف روایتیں لاتے ہیں تو اس کی وضاحت کردیتے ہیں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔قرأت کے سلسلہ میں محض اسی قرأت کا ذکر کرتے ہیں جو تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔نحوی مسائل سے حتی المقدور احتراز کرتے ہیں،البتہ جس جگہ اس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اس پر روشنی ڈال دیتے ہیں۔متقدمین مفسرین میں سے بیضاوی،زمخشری اور بغوی وغیرہ کے اقوال اپنی

تفسیر میں ذکر کر کے بسا اوقات انھیں قبول کر لیتے ہیں اور کبھی ان پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آیات اور سورتوں کے درمیان باہمی ربط و تعلق پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ آیات احکام پر فقہی احکام و مسائل ذکر کرنے کے ساتھ اس سے متعلق مختلف مسالک کا طریقہ عمل اور ان کے دلائل و براہین پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

11.4 برصغیر ہندو پاک میں تفسیر قرآن کریم:

عرب و ہند تعلقات بہت پرانے ہیں۔ اسی بنا پر عرب میں اسلام کی اشاعت کے بعد بہت جلد ہی ہندوستان میں بھی اسلام کے چرچے ہونے لگے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اسلامی علوم و فنون بھی ہندوستان آئے تھے، جن میں سب سے زیادہ قابل قدر خود قرآن کریم ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے قرآن کریم کی خدمت میں کوئی کمی نہ چھوڑی، ہر دور میں انہوں نے اس ضمن میں بے شمار اور بیش بہا تفسیریں اور اس کے متعلقات پر کتابیں تحریر کیں۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کو قرآن کریم کی خدمت کا پہلا موقع بالکل ابتدائی زمانہ ہی میں مل گیا تھا۔ 270ھ میں ایک ہندو راجہ مہروک بن رائق کی خواہش پر منصورہ کے امیر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز نے ایک مقامی مسلمان عالم سے قرآن کریم کا وہاں کے مقامی زبان میں ترجمہ کرایا تھا۔ بعد ازاں پانچویں صدی ہجری میں جن اشخاص نے قرآن کے موضوع پر خدمات انجام دیں ان میں سید محمد اسماعیل بخاری لاہوری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مخلص بن عبداللہ دہلوی (م:766ھ) نے ایک تفسیر ''کشف الکشاف'' کے نام لکھی تھی۔ نظام الدین قمی نیشاپوری (م:730ھ) جو اصلاً ایران کے رہنے والے تھے اور بعد میں دولت آباد آ کر اقامت گزین ہو گئے تھے، انہوں نے پہلی مرتبہ آٹھویں صدی ہجری میں قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ امیر تاتارخان دہلوی (م:799ھ) نے ''تفسیر تاتارخانی'' کے نام سے ایک تفسیر مرتب کی تھی۔ شیخ اشرف جہانگیر سمنانی (م:808ھ) نے ایک تفسیر ''نوربخشیہ'' کے نام سے تحریر کی تھی۔ حضرت گیسو دراز (م:825ھ) نے تفسیر کشاف پر حاشیہ لکھا تھا۔ شیخ احمد بن علی المہائمی (م:836ھ) نے ''تفسیر رحمانی'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی۔ ''بحر مواج'' کے نام سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م:840ھ) نے فارسی زبان میں تفسیر تحریر کی تھی۔ آنحضور ﷺ کی محبت میں ہر وقت سرشار رہنے والے عاشق رسول خواجہ حسین ناگوری (م:901ھ) نے ایک تفسیر ''نورالنبی'' کے نام سے لکھی تھی۔ اسی طرح ایک اور عاشق رسول شیخ حسن محمد المعروف بہ شیخ احمد گجراتی (م:982ھ) ''تفسیر محمدی'' کے نام سے ایک تفسیر مرتب کی تھی۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں ''مجمع البحرین'' کے نام سے شیخ طاہر سندھی برہانپوری نے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی تھی۔ ان کے بعد ایک اہم نام شیخ ملا احمد جیون (م:1130ھ) کا آتا ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کے استاذ تھے۔ انہوں نے تفسیر کے موضوع پر ایک اہم کتاب ''تفسیرات الاحمدیہ'' کے نام سے مرتب کی تھی۔

بعد میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م:1176ھ) کے گھرانہ نے اس کام کو بڑے پیمانہ پر آگے بڑھا، اور خود شاہ صاحب نے مکمل قرآن کریم کا فارسی زبان میں ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے ترجمہ فرمایا اور مختلف مقامات پر مختصر تفسیر بھی درج کی۔ شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیزؒ (م:1239ھ) نے بھی فارسی زبان ہی میں ایک تفسیر ''فتح العزیز'' کے نام سے لکھی تھی جو ''تفسیر عزیزی'' کے نام سے معروف ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دوسرے صاحبزادہ شاہ رفیع الدینؒ نے اردو زبان میں قرآن کریم کا لفظی ترجمہ کیا تھا۔ پھر تیسرے صاحبزادہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے والد بزرگوار کی فارسی زبان کی تفسیر ''فتح الرحمٰن'' کو اردو کے بامحاورہ قالب میں ڈھالا، بعض مقامات پر اردو زبان میں تفسیریں بھی لکھیں۔ اردو کا یہ قالب ''موضح القرآن'' کے نام سے معروف ہوا۔ شاہ صاحب کے گھرانہ کی ان خدمات قرآن کے بعد مسلمانان ہند نے اس باب میں گراں قدر خدمات انجام دیں، جن میں نواب صدیق حسن خان (م:1307ھ) کی فتح القدیر، فتح البیان اور نیل

المرام، مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی (م:1335ھ) کی فتح المنان، مولانا احمد حسن دہلوی (م:1338ھ) کی احسن التفاسیر، مولانا احمد رضا خان بریلوی (م:1340ھ) کی کنز الایمان وخزائن الفرقان، مولانا اشرف علی تھانوی (م:1362ھ) کی بیان القرآن، مولانا ثناءاللہ امرتسری (م:1367ھ) کی تفسیر ثنائی، خواجہ حسن نظامی (م:1373ھ) کی عام فہم تفسیر قرآن، مولانا ابوالکلام آزاد (م:1378ھ) کی ترجمان القرآن، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری (م:1380ھ) کی تفسیر الحسنات، مفتی احمد یار خان نعیمی (م:1391ھ) کی تفسیر نعیمی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م:1394ھ) کی معارف القرآن، مفتی محمد شفیع (م:1396ھ) کی معارف القرآن، مولانا عبدالماجد دریابادی (م:1397ھ) کی تفسیر ماجدی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م:1399ھ) کی تفہیم القرآن، مولانا امین احسن اصلاحی (م:1418ھ) کی تدبر قرآن، مولانا پیر کرم شاہ ازہری (م:1419ھ) کی ضیاء القرآن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر اور اہمیت کے حامل ہیں۔

11.5 علم قرأت:

تفسیر قرآن کریم کے ضمن میں کئی علوم نے جنم لئے، انھیں میں سے ایک اہم علم، علم قرأت وتجوید ہے۔ اس علم کا آغاز قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، البتہ اِس دور سے پہلے اس علم کا زور اس قدر نہ تھا کہ اسے مستقل ایک علم کے طور پر جانا جاتا۔ اس دور میں مختلف علاقوں میں سات قراء مشہور ہوئے جن کا تذکرہ امام کبیر ابوبکر احمد بن موسیٰ بن عباس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان قراء میں نافع بن عبدالرحمٰن مدنی (م:169)، عبداللہ بن کثیر مکی (م:119ھ)، ابوعمرو بن علاء بصری (م:154ھ)، عبداللہ ابن عامر شامی (م:118ھ)، عاصم بن ابی النجو د کوفی (م:128ھ)، حمزہ بن حبیب کوفی (م:155ھ)، علی بن حمزہ کسائی کوفی (م:189ھ) شامل ہیں۔

حدیث نبوی ﷺ میں قرآن کریم کے سات حرفوں پر نزول کی جو بات کہی گئی ہے اس سے مذکورہ بالا قراء کی قرأت مراد نہیں ہے، بلکہ اکثر مفسرین اس رائے کی حامل ہیں کہ امام کبیر ابوبکر نے اپنی کتاب میں ان سات قاریوں کو ایک جگہ جمع کر کے عوام کو مغالطہ میں ڈال دیا ہے، حالانکہ ان کے دور میں اور بھی بہت سے بہترین قراء موجود تھے۔ چنانچہ بعد میں بعض لوگوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ان سات قرأتوں کے ساتھ چند قرأتوں کا اضافہ بھی کیا، اور قراء عشرہ یعنی دس قاری کی اصلاح جاری کی گئی جن میں مذکورہ سات قاریوں کے علاوہ ابوجعفر یزید بن قعقاع (م:132ھ)، یعقوب بن اسحاق حضرمی (م:185ھ) اور خلف بن ہشام (م:229ھ) کو شامل کیا گیا۔ پھر اس فہرست میں مزید چار قاریوں: حسن بصری (م:110ھ)، محمد بن عبدالرحمٰن (م:123ھ) یحییٰ بن مبارک یزیدی (م:202ھ) اور ابوالفرج محمد بن احمد (م:388ھ) کا اضافہ کیا گیا۔

قرأت کا یہ طریقہ اسی طرح اہمیت کا حامل ہے جس طرح قرآنی آیات کی تفسیر میں منقول روایات۔ کیونکہ یہ سند کے التزام کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی طریقہ قرأت کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس طریقہ پر آنحضور ﷺ قرآن کریم کی قرأت فرمایا کرتے تھے تو ظاہری بات ہے اس کی اہمیت دیگر قرأتوں کے مقابلہ میں کافی بڑھ جائے گی۔

بعد کے ادوار میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اس پر کتابیں لکھی گئیں اور عظیم قراء منصۂ شہود پر آتے رہے۔ اس کی تفصیل کے لئے اس موضوع کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

11.6 علوم القرآن:

علوم القرآن دراصل قرآن کریم سے متعلق اسباب نزول، رسم قرآنی، اعجاز قرآن، اعراب قرآن، ناسخ ومنسوخ، مکی ومدنی، عام

وخاص اور قصص واحکام وغیرہ کے علم کو علوم القرآن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق مذکورہ امور کا علم ہو تو لازماً اس آیت میں احکام الٰہی سمجھنے میں آسانی ہوگی۔اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ کے مضافات میں تھے،اور رسول اللہ ﷺ وہاں ایک شاخ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔اسی دوران وہاں سے یہودیوں کی ایک جماعت گذری۔ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ سے روح کے متعلق سوال کیا جائے،لیکن بعض دوسرے لوگوں نے اس سے روک دیا کہ آپ ﷺ ایسی بات فرمادیں گے جوان کو ناگوار ہوگی۔پھر وہ آپ ﷺ کے سامنے آگئے اور کہا کہ اے ابو القاسم! ہمیں روح کے بارے میں بتایئے۔تو آپ ﷺ نے کچھ دیر توقف اختیار کیا۔حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے جان لیا کہ وحی نازل ہورہی ہے،لہٰذا میں وہاں سے پیچھے ہٹ گیا،پھر جب وحی کے نزول کا سلسلہ ختم ہوگیا تو آپ ﷺ سورہ اسراء کی آیت نمبر 85 ''**یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی**'' تلاوت فرمائی۔(بخاری:7297) ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وہاں موجود تھے،لہٰذا اس آیت کے اسباب نزول جس بہتر طریقہ پر حضرت ابن مسعود بیان کریں گے اس سے بہتر بیان کرنا کسی دوسرے کے لئے مشکل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسباب نزول کا جاننا جو علوم القرآن کا ایک حصہ ہے اہمیت کا حامل ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں جبکہ وحی کے نزول کا سلسلہ جاری تھا،تو مذکورہ امور کی اہمیت نا ہونے کے برابر تھی،کیونکہ وحی کا نزول کن حالات اور واقعات کے پیش نظر ہورہا تھا ان کا وہ خود مشاہدہ کررہے تھے،نزول قرآن کی کیفیت،آیات کے سبب نزول اور ان کے ناسخ ومنسوخ وغیرہ سے وہ بخوبی واقف تھے،اس کے علاوہ قرآن کریم کی تفسیر اور تشریح وتوضیح کے لئے رسول اللہ ﷺ بذات خود موجود تھے۔پھر اس کے بعد کے قریبی ادوار میں بھی اس کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی گئی لہٰذا اس کی تدوین کی جانب لوگوں نے توجہ نہ کی۔البتہ اس کا باقاعدہ آغاز مفسرین کے مطابق حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں اس وقت ہوا،جب مختلف علاقوں کے باشندے اختلاف قرأت کی بنیاد پر آپس میں جھگڑنے لگے تھے۔اس جھگڑے اور اختلاف کو ختم کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ نے ان کو ایک مصحف پر جمع کیا تھا۔چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ کا یہ عمل ہی دراصل علوم القرآن کا نکتہ آغاز ثابت ہوا۔پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہد خلافت میں عربی کے اصول وضوابط مرتب کروائے تاکہ غیر عرب عربی زبان اور قرآن کریم کو اچھی طرح پڑھ اور سمجھ سکے۔آپؓ کے اس عمل سے اعراب قرآن کی بنیاد پڑی جو علوم القرآن کا ایک حصہ ہے۔

علوم القرآن کی تدوین کا باقاعدہ آغاز تیسری صدی ہجری سے ہوتا ہے۔اس کے بعد یہ سلسلہ زور پکڑتا گیا اور ہر دور میں بیش قیمتی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔آغاز سے انتہاء تک علوم القرآن پر کتابوں کی لمبی فہرست ہے،جن میں قتادہ بن دعامہ السدوسی (م:117ھ) کی کتاب الناسخ والمنسوخ فی کتاب اللہ تعالیٰ،ابوعبیدہ معمر بن مثنی (م:210ھ) کی مجاز القرآن،سعید بن سعدہ اخفش (م:215ھ) کی معانی القرآن،ابوعبیدہ قاسم بن سلام (م:224ھ) کی فضائل القرآن اور غریب القرآن،عبداللہ بن یحییٰ یزیدی (م:237ھ) کی غریب القرآن،ابن قتیبہ (م:276ھ) کی تفسیر غریب القرآن،محمد بن ایوب (م:294ھ) کی **فضائل القرآن وما انزل من القرآن بمکة وما نزل بالمدینة**،محدث امام احمد بن شعیب النسائی (م:303ھ) کی فضائل القرآن،محمد بن خلف بن مرزبان (م:310ھ) کی الحاوی فی علوم القرآن،جعفر بن محمد فریابی (م:311ھ) کی فضائل القرآن،ابوبکر محمد بن قاسم الانباری (م:328ھ) کی عجائب علوم القرآن،واحدی (م:468ھ) کی اسباب النزول،قاضی باقلانی (م:403ھ) کی اعجاز القرآن وغیرہ شامل ہیں۔یہ علوم القرآن پر صرف وہ تالیفات ہیں جو بالکل ابتدائی عہد میں لکھی گئی تھیں۔

11.7 اکتسابی نتائج

- تدوین تفسیر کے پہلے مرحلہ میں تفسیری روایات کتب احادیث میں جمع کی جاتی تھیں۔
- اس کے دوسرے مرحلہ میں تفسیر کی مستقل کتابیں مرتب کرنے کا آغاز ہوا، لیکن ان میں قرآنی آیات کی تفسیر قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور آثار صحابہ کے ذریعہ ہی کی جاتی تھی۔ ان تفاسیر کو تفسیر بالماثور کے ضمن میں شمار کیا جاتا ہے۔
- تیسرے مرحلہ میں تفسیر کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس مرحلہ میں تفسیری کتابوں کو تفسیر بالرائے کے طرز پر مرتب کئے جانے کا آغاز ہوا۔
- تفسیر اقوال گڑھنے کے پیچھے بنیادی طور پر تین وجوہات تھیں: گروہی تعصب، سیاسی برتری اور جذبہ انتقام
- اسرائیلی روایات میں سے صرف وہی روایات قابل اعتبار ہیں جو شریعت کے مزاج اور مذاق سے ہم آہنگ ہیں۔
- برصغیر ہندو پاک میں بھی تفسیر قرآن کریم کے باب میں گراں قدر خدمات انجام پائی ہیں۔ ہندوستان میں اس کا پہلا ترجمہ 270ھ میں کیا گیا تھا۔
- تفسیر قرآن کے ضمن ہی میں علم قرأت اور علوم القرآن کا آغاز ہوا۔

11.8 نمونۂ امتحانی سوالات

11.8.1 معروضی سوالات:

1- سعید بن جبیرؒ کے کون شاگرد تھے جو ان سے تفسیری روایات نقل کیا کرتے تھے؟

(أ). عطاء بن دینار (ب). شعبہ بن حجاج (ج). وکیع بن الجراح (د). یحییٰ بن سعید القطان

2- معالم التنزیل کن کی مرتب کردہ تفسیر ہے؟

(أ). حسین بن مسعود (ب). ابن راہویہ (ج). ابواللیث سمرقندی (د). امام ثعلبی

3- تفسیر بحر العلوم کس طرز پر لکھی گئی تفسیر ہے؟

(أ). تفسیر بالماثور (ب). تفسیر بالرائے (ج). نحوی (د). سب غلط

4- سفیان بن عیینہ نے عقل پرستوں کے نظریات کی تردید کے لئے کون سی کتاب لکھی تھی؟

(أ). المطالب العالیہ (ب). جوابات القرآن (ج). السراج المنیر (د). التفسیر الکبیر

5- امام مجاہد نے کس صحابی رسول سے قرآن کریم کی تفسیر لکھی تھی؟

(أ). حضرت ان مسعودؓ (ب). حضرت علی مرتضیٰؓ (ج). حضرت ابن عباسؓ (د). حضرت زید بن ثابتؓ

6- امام شافعی نے اپنی تفسیر کس موضوع پر مرتب کی تھی؟

(أ). متشابہات القرآن (ب). غرائب القرآن (ج). احکام القرآن (د). سب غلط

7- درج ذیل میں سے کون امام بغوی کے اساتذہ میں سے نہیں ہیں؟

(أ). ابواسحاق (ب). ابومحمد عبداللہ بن حامد (ج). ابوالقاسم (د). ابن راہویہ

8- مفسرین نے اسرائیلی روایات کو قبول اور عدم قبول کے اعتبار سے کتنے خانوں میں تقسیم کیا ہے؟

(أ). دو (ب). تین (ج). چار (د). پانچ

9- امام ابن جریر طبری اصلاً کہاں کے باسی تھے؟

(أ). طبرستان (ب). خراسان (ج). دمشق (د). بغداد

10- ''تفسیر القرآن العظیم'' کس نام سے معروف ہے؟

(أ). تفسیر طبری (ب). تفسیر ثعلبی (ج). تفسیر بغوی (د). تفسیر ابن کثیر

11.8.2 مختصر جوابی سوالات:

1- تدوین تفسیر کے پہلے مرحلہ پر ایک نوٹ لکھئے۔

2- تفسیری اقوال گڑھنے کی وجوہات پر روشنی ڈالئے۔

3- اسرائیلی روایات کے قبول اور عدم قبول کے سلسلہ میں اپنی معلومات سپرد قلم کیجئے۔

4- تفسیر بالماثور سے کیا سمجھتے ہیں؟ مثالوں کے ساتھ لکھئے۔

5- علوم القرآن کا تعارف پیش کرتے ہوئے تفسیر قرآن میں اس کی اہمیت وضرورت کی وضاحت کیجئے۔

11.8.3 طویل جوابی سوالات:

1- تدوین تفسیر کے دوسرے مرحلہ کا مفصل جائزہ لیجئے۔

2- تدوین تفسیر کے تیسرے مرحلہ کی نمایاں تبدیلیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس دور کے تین تفاسیر کا تعارف پیش کیجئے۔

3- برصغیر پاک وہند میں تفسیر کا تاریخی جائزہ لیجئے۔

11.9 تجویز کردہ کتابیں

1- تاریخ التفسیر : ڈاکٹر عبدالصمد صارم ازہری

2- تذکرۃ المفسرین : قاضی محمد زاہد حسینی

3- علوم القرآن : مولانا گوہر رحمٰن

4- علوم القرآن : مولانا محمد تقی عثمانی

5- تاریخ تفسیر ومفسرین : پروفیسر غلام احمد حریری

6- الاتقان فی علوم القرآن : علامہ جلال الدین سیوطی (اُردو ترجمہ)

7- تاریخ تفسیر واصول تفسیر : پروفیسر میاں منظور احمد

8- علوم القرآن : ڈاکٹر صبحی صالح (اُردو ترجمہ)

9- تذکرہ مفسرین ہند : محمد عارف اعظمی عمری

-:oOo:-

C:\Users\haziq\Downloads\SA - Zakat - Final - 03-Dec-2020.inp 29-01-2022 16:23 PAGE 155 (1,1)